نقشِ رہگزر
کوثر نیازی

بسم اللہ الرحمن الرحیم

نقشِ رہگذر

کوثر نیازی

جنگ پبلشرز

اکیسویں صدی کے تقاضوں سے ہم آہنگ

ہر عمر اور ہر ذوق کے قارئین کے لئے

خوبصورت اور معیاری مطبوعات ۵

اشاعت اول	:	اگست 1991ء
تعداد	:	1000
قیمت	:	90 روپے
بیرون ملک قیمت	:	9 امریکن ڈالرز
سرورق	:	انیس یعقوب
اہتمام	:	مظفر محمد علی
ناشر	:	جنگ پبلشرز۔ لاہور
مطبع	:	جنگ پبلشرز پریس 13۔ سر آغاخان روڈ لاہور

انتساب

بآں گروہ کہ از ساغرِ وفا مستند
سلامِ ما برسانیہ ہر کجا ہستند

مصنف بھارت کے سابق آنجہانی وزیر اعظم راجیو گاندھی کے ساتھ

مندرجات

پیش گفتار

سالِ گذشتہ کے آخر میں حُسنِ اتفاق سے مجھے ایک ماہ کے لئے بھارت کا دورہ کرنے کا موقع ملا' واپسی پر "جنگ" میں اپنے کالم "مشاہدات و تاثرات" میں مَیں نے کئی قسطوں میں اپنی رودادِ سفر اہلِ وطن کے سامنے پیش کی تو بلا مبالغہ بیسیوں موصول ہونے والے خطوط کے ذریعے جو ردِّ عمل مجھ تک پہنچا وہ یہ تھا کہ "یہ باتیں تو ہمارے لئے بالکل نئی ہیں"۔

اس سے پانچ سال پیشتر 1984ء میں بھی مَیں نے دہلی کا چند روزہ سفر کیا تھا اور حضرت خواجہ غریب نوازؒ کے مزار پر بھی حاضری دی تھی یہ سفرنامہ بھی سات قسطوں میں شائع ہو چکا ہے جب یہ سفر ہُوا تھا تو بھارت میں اندرا گاندھی کی حکومت تھی' دوسرا سفر کیا تو ان کے بیٹے راجیو گاندھی انتخابات کی زد میں تھے اور ان کے چل چلاؤ کے دن تھے مگر اس کے باوجود دونوں سفرناموں میں پائی جانے والی ذہنی فضا یکساں ہے۔ ان کے مندرجات عارضی اور وقتی اخباری نوعیت کے نہیں ان میں تصوّف' تاریخ اور ادب و سیاست کے بعض اہم گوشے زیرِ بحث آئے ہیں۔ قارئین کا تقاضا تھا کہ انہیں کتابی صورت میں محفوظ کر لیا جائے' "نقشِ راہگذر" اسی امتثالِ امر کا عملی روپ ہے۔

بد قسمتی سے ہمارے ہاں بعض حلقوں میں یہ ذہنیت کار فرما ہے کہ ہم اپنے سوا نہ کسی کو اچھا انسان سمجھتے ہیں نہ اچھا مسلمان' بھارت کے مسلمان جو تعداد میں ہم سے دو گنا ہیں ان کے بارے میں ہمارے تصوّرات تو کچھ اور بھی عجیب و غریب ہیں مگر یہ سفرنامہ پڑھنے والے دیکھیں گے کہ جو رفاہی' تعلیمی' دینی

اور سماجی کام وہ کر رہے ہیں اس کا عشرِ عشیر بھی ہمارے ہاں نظر نہیں آتا۔

جس وقت یہ کتاب شائع ہو رہی ہے بد قسمتی سے دونوں ملکوں کے درمیان کشیدگی عروج پر ہے مگر یہی وقت تو جوش سے زیادہ ہوش سے کام لینے کا ہے دونوں ملکوں کے درمیان تعلقات بہتر ہوں گے تو بھارت کے اٹھارہ کروڑ مسلمانوں کی اجتماعی زندگی پر بھی اس کا خوشگوار اثر پڑے گا اور یہ حالات خراب ہوں گے تو اس آگ کی تپش ان تک بھی پہنچے گی۔ ہندوستان کے بارے میں اپنی خارجہ پالیسی وضع کرتے وقت ہم اس نکتے کو ذہن میں رکھیں تو بہت سے وہ مسائل پیدا نہ ہوں جو اس وقت پیدا ہو رہے ہیں۔

خدا کرے کہ جذباتی تناؤ کے اس عالم میں یہ کتاب دو پڑوسی ملکوں کے سوچنے سمجھنے والے لوگوں کے لوں میں ایک دوسرے کے لئے نرم گوشہ پیدا کر سکے۔

کوثر نیازی

1-7-90

1984ء

بارگاہِ محبوب الٰہی میں

یوں تو تصوف کے تمام سلاسل کے بزرگوں سے عقیدت رکھتا ہوں مگر طبعاً اپنے آپ کو سلسلۂ چشتیہ سے زیادہ قریب پاتا ہوں، اس نسبت سے حضرت غریب نواز خواجہ معین الدین چشتی اجمیریؒ کی عقیدت نس نس میں رچی ہوئی ہے، عرصہ سے تمنا تھی کہ ان کے مزارِ پُرانوار پر حاضری دوں اور آنکھوں کو خطۂ اجمیر کی زیارت سے شاد کام کروں مگر بار بار ارادہ باندھنے کے باوجود ہر مرتبہ کوئی نہ کوئی رکاوٹ ایسی پیش آتی رہی کہ سفر ملتوی ہوتا رہا تا آنکہ اب کے قسمت نے یاوری کی اور مجھے اپریل کے دوسرے ہفتے میں اپنی یہ دیرینہ تمنا پوری کرنے کا موقع مل گیا یہ سفر اگرچہ چند گھنٹوں کا سفر تھا مگر بلاشبہ یہ میری زندگی کے یادگار لمحوں میں شامل ہونے کے لائق تھا۔ اس کی روداد تو سناؤں گا ہی مگر سفرِ اجمیر کی وجہ سے چند دن عروس البلاد دہلی میں رہنے کا جو اتفاق ہوا اور یہاں کی مختلف محفلوں میں جانے اور بعض اہم شخصیات سے ملنے کا جو موقع ملا اس کی تفصیلات بھی اس قابل ہیں کہ پیش کی جائیں۔ بھارت جانے والے ادیبوں اور شاعروں کے سفرنامے تو آپ کی نظر سے گزرتے ہی رہتے ہیں میری یہ تحریر اس لحاظ سے مختلف ہوگی کہ اس میں سفرنامہ کی جھلک ہونے کے ساتھ ساتھ بھارتی حکومت اور سوسائٹی کے بارے میں میرے تاثرات اور پاک وہند تعلقات کی راہ میں حائل مسئلوں اور ان پر دونوں طرف کے نقطہ ہائے نظر کا بے لاگ اظہار بھی شامل ہو گا یہ کوشش کروں گا کہ بات ایجاز واختصار کے ساتھ ہو اور دو تین قسطوں میں ختم ہو جائے لیکن اگر ایسا ممکن نہ ہو سکا تو امید ہے قارئین اس سے زیادہ طوالت کو بھی گوارا کر لیں گے۔

دہلی پہنچ کر میری پہلی خواہش حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء محبوبِ الٰہیؒ کے آستانۂ فیض پر بوسہ دینے کی تھی، حضرت خواجہ حسن نظامی دہلویؒ کے صاحبزادے خواجہ حسن ثانی نظامی میرے پرانے کرم فرماؤں میں سے ہیں آج سے چوبیس پچیس سال پہلے ان سے لاہور میں ملاقات ہوئی تھی۔ مدیرِ نیرنگِ خیال حکیم محمد یوسف حسن مرحوم نے اپنی قیام گاہ واقع فلیمنگ روڈ لاہور پر ایک مخصوص شعری نشست کا اہتمام کیا تھا خواجہ صاحب ان دنوں لاہور آئے ہوئے تھے اور اپنے ارادت مندِ خاص جناب عابد نظامی کے ہاں قیام پذیر تھے، انہیں اس محفل میں مہمان خصوصی بنایا گیا میں نے بھی اس میں اپنا کلام پڑھا اس وقت سے لے کر آج تک خواجہ صاحب سے جو رشتۂ خاطر اُستوار ہوا ہے تو اُستوار تر ہی ہوتا چلا گیا ہے۔ بعد میں ایک مرتبہ حج کے دوران ملاقات ہوئی تو دیکھا انہوں نے داڑھی بھی بڑھا لی ہے۔ 1979ء میں ایک دو دنوں کے لئے دلّی جانا ہوا تو بڑے تپاک سے ملے، بڑے اچھے شکاری ہیں ان دنوں ہرن کا شکار کر رکھا تھا، بڑے اہتمام سے اسے خود ہی پکایا اور بڑی محبت سے کھلایا۔ اتنے دیرینہ تعلقات کے ہوتے ہوئے کیسے ممکن تھا کہ انہیں اپنے آنے کی اطلاع نہ کرتا، مزار سے ملحق اور متصل ہی ان کی قیام گاہ ہے، یہیں منادی کا دفتر بھی ہے جسے ان کے نامور والد اور اردو زبان کے صاحبِ طرز ادیب اور انشاء پرداز حضرت خواجہ حسن نظامیؒ نے جاری کیا تھا اور جسے حسن ثانی اپنا خونِ جگر صَرف کر کے اب بھی زندہ رکھے ہوئے ہیں۔

بستی نظام الدین اولیاءؒ پہنچا تو نقشہ ہی کچھ اور تھا، آج سے چند سال پہلے یہاں اک کچّی سی آبادی تھی، قریب میں ایک قبرستان، اب نہ کچّے مکان نظر آئے نہ کہیں قبریں، انہیں مسمار کر کے ہر طرف دکانیں اور پختہ مکان بنا لئے گئے ہیں۔ مجھے یاد ہے پچھلی مرتبہ ہماری گاڑی بالکل روضے کے باہر جا رکی تھی اب کے ایک پُر رونق بازار سے گزر کر کافی پیدل چلنا پڑا تب کہیں جا کر خواجہ صاحب کی بیٹھک دکھائی دی، دلّی کے مشہور ادیب جناب رئیس مرزا کو میری آمد کی اطلاع ہو چکی تھی وہ بھی یہیں پر مل گئے، چائے پی اور پھر خواجہ صاحب کی معیت میں بارگاہِ نظام الدین اولیاءؒ میں شرف باریابی حاصل کیا۔

درگاہ کی آمدنی بے شمار ہے لیکن باقاعدہ نظام نہ ہونے کی وجہ سے اس کا بیشتر حصہ "خدّام" لے اُڑتے ہیں، مزار تک جاتے جاتے کتنے ہی خود ساختہ مدرسوں، یتیم خانوں اور مسجدوں کے "سفیروں" سے مڈبھیڑ ہوئی۔ خواجہ صاحب آگے آگے تھے اس لئے ہم تو کسی کے قابو نہیں آئے ورنہ کوئی انجان اس گروہ میں پھنس جائے تو بڑی مشکل سے اپنی جیب محفوظ رکھ پاتا ہے۔ حضرت امیر خسرو کا مزار بھی احاطے میں ہے جن کے "سوزِ دل" کے طفیل حضرت خواجہ نظام الدینؒ اپنے رب سے التجا گزار ہوا کرتے تھے، وہاں فاتحہ پڑھی اور پھر حضرت محبوبِ الٰہیؒ کی قبر مبارک پر پہنچے تذکروں میں لکھا ہے کہ حضرت بابا فرید الدین گنج شکرؒ آپ سے خوش ہوتے تو دعا دیا کرتے "خدا تمہیں درد دے" آپ کو نصیحت فرماتے تو کہتے "اپنے رب سے تین چیزیں مانگا کرو...... وقت خوش و آبِ دیدہ و راحتِ دل"۔

اس بارگاہِ گردوں مآب میں قدم رکھا تو یوں لگا جیسے دل درد کی دولت سے مالا مال ہو گیا ہے، آنکھوں

سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے' بے اختیار اقبالؒ کے وہ اشعار زبان پر جاری ہو گئے جو انہوں نے حضرت خواجہ حسن نظامیؒ کی معیت میں درگاہ کی زیارت کے موقع پر سپردِ قلم کئے تھے :-

فرشتے پڑھتے ہیں جس کو وہ نام ہے تیرا
بڑی جناب تیری فیض عام ہے تیرا
ستارے عشق کی تیری کشش سے ہیں قائم
نظامِ مہر کی صورت نظام ہے تیرا
تیری لحد کی زیارت ہے زندگی دل کی
مسیح و خضر سے اونچا مقام ہے تیرا
نہاں ہے تیری محبت میں رنگِ محبوبی
بڑی ہے شان بڑا احترام ہے تیرا

دُر دِ نظامی میں ہے حضرت خواجہ نظام الدین اولیاءؒ نے فرمایا......

"انوارِ روحانی کے دس درجے ہیں

نورِ روح
نورِ عقل
نورِ معرفت
نورِ علم
نورِ یقین
نورِ توفیق
نورِ بصر
نورِ حیا
نورِ محبت
اور نورِ عشق"

فرمایا کہ :-

"نورِ عشق انوار روحانی کا آخری درجہ ہے اور عشق عشقہ سے نکلا ہے یہ ایک بیل ہے جو درختوں کو اپنی لپیٹ میں لے لیتی ہے تو خود پنپتی رہتی ہے مگر انہیں پنپنے نہیں دیتی اسی طرح جو شخص عشق کی لپیٹ میں آجائے اس کا عشق تو پنپتا رہتا ہے لیکن وہ خود اس آگ میں جل کر بھسم ہو جاتا ہے"۔

ایسے لگا جیسے میرا وجود جل کر راکھ ہو گیا ہے اور اس کے اندر عشق کی چنگاری جل اٹھی ہے کاش یہ

لمحے جاودانی اور دوامی ہوتے مگر مجھ ایسے مادیت زدہ گنہگار کی یہ قسمت کہاں ؟اس بار گاہِ عصیاں پناہ سے نکلوں گا تو دل کی وہی حالت ہو جائے گی ،مکروہاتِ زمانہ کی دلدل اس چنگاری کو کہاں روشن رہنے دے گی۔ خانقاہ سے متصل ہی حضرت حسن نظامیؒ کا مزار ہے، یہیں پر جناب حسن ثانی نے خواجہ حسن نظامی میموریل سوسائٹی قائم کر رکھی ہے جو تصوّف پر اعلیٰ درجے کی کتابیں بھی چھاپتی ہے اور اپنے شاندار ہال میں وقتاً فوقتاً مجالسِ مذاکرہ بھی منعقد کرتی رہتی ہے خواجہ صاحب کی قبر کا کتبہ ایک یادگار چیز ہے۔ یہ انہوں نے اپنی زندگی میں قلمبند کیا تھا ان کے اسلوبِ خاص میں یہ تحریر عجیب دل گداز اور پُر اثر تحریر ہے، خلاصہ اس کا یہ ہے کہ یہاں وہ سو رہا ہے جس کی شہرت کی دھوم تھی، تحریر کا چرچا تھا، تقریر کا شہرہ تھا مگر اب اس حال میں ہے کہ دعا کے دو بولوں کا محتاج ہے گویا وہی بات کہ۔

جینا وہ کیا جو ہو نفسِ غیر پر مدار
شہرت کی زندگی کا بھروسہ بھی چھوڑ دے

خانقاہ کے قریب ہی میں مرزا غالبؔ کی قبر ہے، پچھلی مرتبہ جانا ہوا تھا تو مجھے معلوم نہ تھا کہ اردو کا سب سے بڑا شاعر یہیں آسودۂ خواب ہے۔ فاتحہ پڑھے بغیر ہی لوٹ آیا تھا اس کا بڑا قلق تھا اب کے یہ ارادہ لے کر چلا تھا کہ اس غلطی کی ضرور تلافی کروں گا میں ان لوگوں میں سے ہوں جن کا اس فرمودۂ اقبال پر پورا پورا الیقین ہے کہ شعروادب کے اعتبار سے دلّی کی سرزمین میں غالبؔ کا کوئی ہم سر نہیں۔

اے جہان آباد! اے گہوارۂ علم و ہنر
ہیں سراپا نالۂ خاموش تیرے راہ گزر
ذرّے ذرّے میں ترے خوابیدہ ہیں شمس و قمر
یوں تو پوشیدہ ہیں تیری خاک میں لاکھوں گہُر
دفن تجھ میں کوئی فخرِ روزگار ایسا بھی ہے؟
تجھ میں پنہاں کوئی موتی آبدار ایسا بھی ہے؟

پھر اب کے غالبؔ کی قبر پر حاضری دینے کا داعیہ اور بھی پیدا ہو گیا تھا، اردو کے مشہور شاعر حضرت ساغرؔ نظامی بھی (جن کا چند ماہ پیشتر انتقال ہوا ہے) غالبؔ کے احاطے میں مدفون ہیں۔ حضرت ساغرؔ عزیزم شہزاد خان کے تایا تھے اور شہزاد کئی سال میرے پرائیویٹ سیکرٹری کی حیثیت سے کام کرنے اور اپنے ذاتی اوصاف و محاسن کی وجہ سے مجھے بہت عزیز ہیں۔ ان سے وعدہ کر کے چلا تھا کہ ساغرؔ صاحب کی قبر پر ضرور فاتحہ پڑھ کر آؤں گا۔ پچھلے سفر میں ساغرؔ صاحب نے میرے اعزاز میں ایک پُر تکلف دعوت کا انتظام کر رکھا تھا مگر میں اپنی نالائقی کی وجہ سے اس میں نہیں پہنچ پایا تھا۔ سو اب کے دونوں غلطیوں کی تلافی کی۔ قبرِ غالبؔ پر فاتحہ نہ پڑھ سکنے اور حضرت ساغرؔ کی دعوت میں نہ پہنچ پانے کی غلطیوں کی...... دونوں کے لئے خوب خوب دعا کی۔ خواجہ حسن ہمراہ تھے، ساغرؔ صاحب کے بارے میں انہوں نے پتے کی بات کہی، کہنے

لگے:۔

"ان کے نام کے ساتھ نظامی کی جو نسبت لگی تھی اس کا صلہ انہیں یہ ملا کہ غالبؔ کے ساتھ قبر بنی۔ اردو کے ہر بڑے شاعر کے دل میں یہی حسرت رہی ہوگی مگر یہ رُتبۂ بلند صرف جناب ساغرؔ نظامی کے لئے مقدّر ہوا"۔
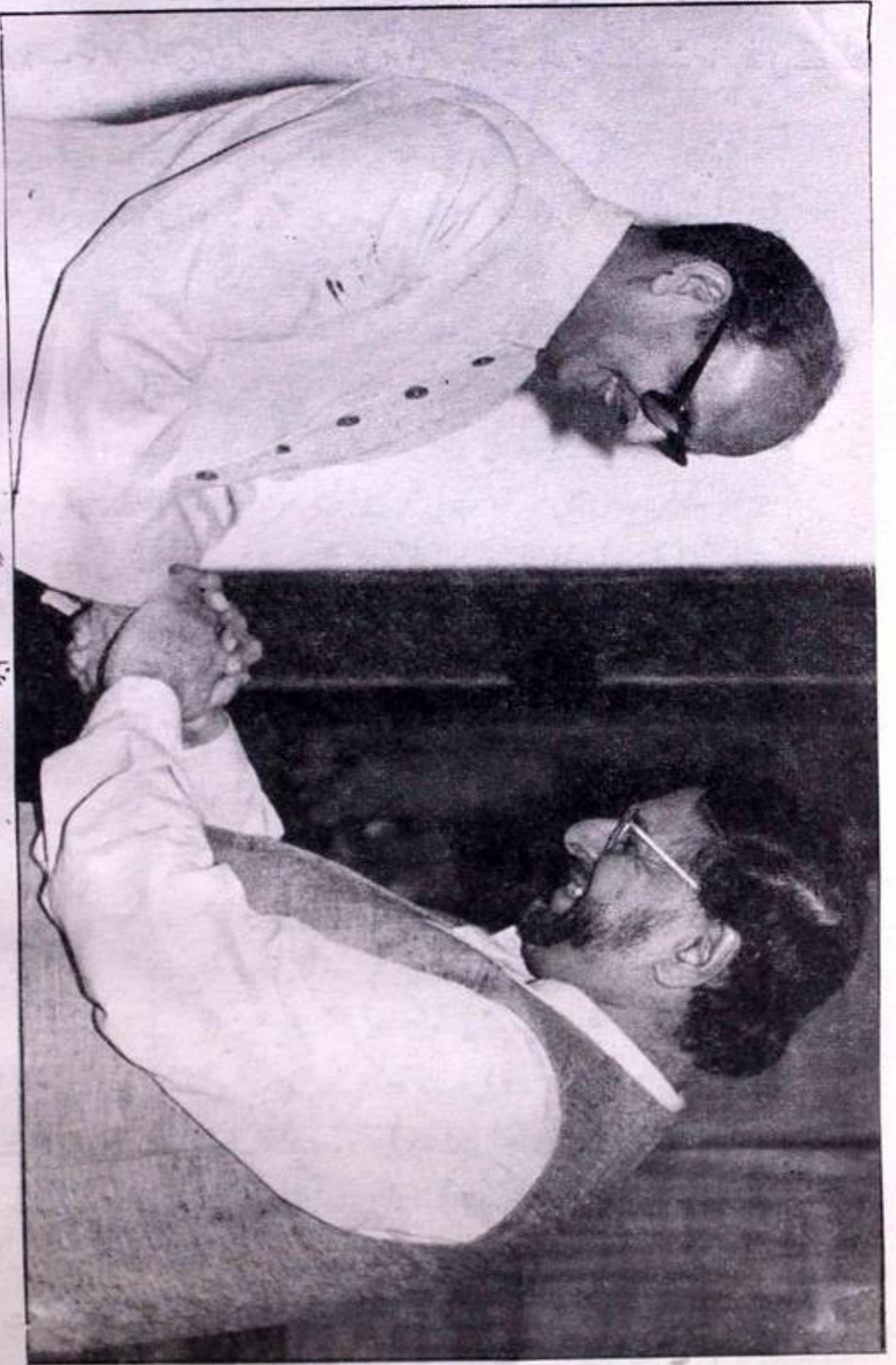
مصنف بھارت کے سابق وزیرِ اعظم وی۔ پی سنگھ کے ساتھ

حضرت شیخ سلیم چشتی کے حضور

اگلے دن آگرے کے لئے رختِ سفر باندھا۔ تاج محل مَیں پچھلی مرتبہ دیکھ چکا تھا اب کے اصل تمنّا فتح پور سیکری میں حضرت شیخ سلیم چشتیؒ کے مزار پر حاضری کی تھی (گو تاج محل کو دوبارہ دیکھنے کی آرزو پر قابو پانا بھی کسی صاحبِ ذوق کے بس کی بات نہیں) آگرہ اور فتح پور سیکری کی عمارات کے کیا کہنے۔ انہیں سینکڑوں سال ہو گئے مگر ہنرمندی اور ہنروری کے جو نقوش انہوں نے جریدۂ عالم پر ثبت کئے ہیں وہ آج بھی جگمگ جگمگ کر رہے ہیں۔ سچ ہے مردانِ آزاد کے فن کی بات ہی............ از جہانِ دیگر است' مَیں مغلوں کا فنِ تعمیر دیکھ رہا تھا اور مجھے "بندگی نامہ" میں کہے ہوئے علاّمہ اقبالؒ کے وہ اشعار یاد آ رہے تھے جو انہوں نے "صنعتِ آزادگان" پر ارشاد فرمائے ہیں۔

"یک زماں با رفتگاں صحبت گزیں
صنعتِ آزاد مرداں ہم بہ بیں

(کچھ وقت کے لئے پچھلوں کی ہم نشینی اختیار کر اور آزاد مردوں کے ہنر پر بھی نگاہ ڈال)

خیز و کارِ ایبک و سُوری نگر
وا نما چشمے اگر داری جگر

(ذرا ایبک اور شیر شاہ سوری کا کام بھی دیکھ اور اگر دیکھنے کی ہمت رکھتا ہے تو اپنی آنکھیں

کھول کر دیکھ)

خویش را از خود بروں آوردہ اند
ایں چنیں خود را تماشا کردہ اند

(انہوں نے اپنی ذات کا اس درجہ نظارہ کیا ہے کہ (اپنے فن کے ذریعے) وہ اپنی ذات کو (اپنے جسم کے خول سے) باہر نکال کے لے آئے ہیں)

سنگ ھا با سنگ ھا پیوستہ اند
روزگاری را بآنے بستہ اند

(انہوں نے پتھروں کو پتھروں کے ساتھ جوڑ دیا ہے اور اس طرح (وقت کی رفتار روک کر) زمانے کو ایک لمحے کے ساتھ باندھ کر رکھ دیا ہے)

دیدن او پختہ تر سازد ترا
در جہانِ دیگر اندازد ترا

(اس فن کا نظارہ تجھے پختہ کر دے گا اور (جیتے جی) دوسرے جہان میں پہنچا دے گا)

یک نظر آں گوہرِ نابے نگر
تاج را در زیرِ مہتابے نگر

(ایک نظر اس گوہر آبدار کو بھی دیکھ اور چاندنی میں تاج محل پر بھی نگاہ ڈال)

مرمرش ز آبِ رواں گردندہ تر
یک دمِ آں جا از ابد پائندہ تر

(اس کا سنگ مرمر بہتے ہوئے پانی سے کہیں زیادہ گردش میں ہے اور یہاں ایک لمحہ بسر کرنا بھی حیاتِ جاودانی کی مانند ہے)

عشقِ مرداں سرِّ خود را گفتہ است
سنگ را با نوکِ مژگاں سُفتہ است

(یہاں اہلِ دل کے عشق نے اپنے بھید کھولے ہیں اور ان کی پلکوں نے پتھروں کو پرو دیا ہے)

عشقِ مرداں پاک و رنگیں چوں بہشت
می کشاید نغمہ ھا از سنگ و خشت

(اہلِ دل کا وہ جذبۂ عشق جو بہشت کی مانند پاک اور حسین ہوتا ہے اس کے دم قدم سے پتھروں سے بھی نغمے پھوٹ نکلتے ہیں)

تو آگرہ اور فتح پور سیکری کا فنِ تعمیر اسی جذبۂ عشق کا مرہونِ منت ہے جس نے ان کے نقش کو جاوداں بنا دیا ہے۔ ہم پہنچے تو چلچلاتی گرمی تھی لیکن دساور سے آئے ہوئے سینکڑوں افراد تاج محل کی ایک جھلک دیکھنے کو بے قرار تھے۔

تاج محل تو پھر تاج محل ہے، فتح پور سیکری میں حضرت شیخ سلیم چشتیؒ کے مقبرے کا بھی جواب نہیں۔ ایسے لگتا ہے جیسے اس کے ارد گرد پھیلا ہوا وسیع و عریض صحن ایک جھیل ہے اور اس میں یہ مقبرہ ایک سفید کنول کی مانند تیر رہا ہے۔ اسی صحن میں تعمیر شدہ مسجد بھی قابلِ دید ہے۔ کہتے ہیں کہ اپنے مقبرے کی بنیاد حضرت شیخؒ نے خود اپنے ہاتھوں سے رکھ چھوڑی تھی بعد میں اکبر بادشاہ نے اس پر مقبرے کی تکمیل کی۔
حضرت شیخ سلیم چشتیؒ حضرت بابا فرید گنج شکرؒ کی اولاد میں سے تھے' 897ء میں پیدا ہوئے۔ عالمِ شباب میں سیاحت کو نکل کھڑے ہوئے اور عرب و عجم میں گھومتے پھرتے حرمین شریفین پہنچے۔ بعد میں سیکری کے مقام پر آ کر بس گئے۔ اللہ تعالیٰ نے حالات میں کشادگی پیدا کی' عمارتیں' باغ اور کنوئیں بنوائے۔ حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ اپنی کتاب "اخبار الاخیار" میں لکھتے ہیں کہ:-

> "نماز اہلِ حرمین کے ذوق کے مطابق اوّل وقت میں پڑھتے اور بعض مخالفِ شریعت عادات جو عوام میں پیدا ہو گئی تھیں انہیں دُور کرنے کی سعی فرماتے اور طالبوں کو ریاضت و مجاہدہ کی ہدایت کرتے۔ آپ کی مجلس بظاہر امراُو حکّام کی محفلوں کے مشابہ ہوتی' کسی کو نصیحت فرماتے اور کسی کو جھڑکتے تھے۔ جن لوگوں کو آپ کی خدمت کا شرف حاصل ہوا وہ آپ کے کشف و کرامت و تصرفِ ظاہر و باطن کے بارے میں عجیب و غریب واقعات بیان کرتے ہیں"۔

اور انہی کرامات میں سے ایک کرامت یہ بھی تھی کہ شہنشاہ اکبر اولادِ نرینہ سے محروم تھا آپ کی خدمت میں حاضر ہو کر دعا کا طلب گار ہوا۔ شیخ کی دعا کے نتیجے میں جہانگیر پیدا ہوا جس کا نام اکبر نے آپ کے نام پر سلیم رکھا۔ ہیموں بقال کے زمانے میں اس کے مظالم سے تنگ آ کر آپ نے حرمین شریفین ہجرت کی۔ چودہ سال کے بعد واپسی ہوئی اور 979ء کے رمضان المبارک میں بحالتِ اعتکاف اللہ کو پیارے ہوئے۔ اس وقت سے لے کر آج تک آپ کا مزار مرجعِ خلائق ہے۔ اِس نانہجار نے بھی کچھ دیر مراقبہ کیا تو انوار کا عجیب و غریب مشاہدہ ہوا اور سینہ انبساط و انشرح سے معمور ہو گیا۔

کہاں ایسا مقدّر تھا کہ ہم کو یہ شرف ملتا
عنایت ہے کہ سائے میں ترے دامن کے بیٹھے ہیں

خواجہ غریب نوازؒ کے آستانے پر

اجمیر شریف میں عرس کے دنوں میں اتنی بھیڑ بھاڑ ہوتی ہے کہ دلجمعی سے حضورِ خواجہ رحمتہ اللہ علیہ سلام کرنا بھی مشکل ہوتا ہے۔ اس لئے میں نے جان بوجھ کر عرس کے چند دن کے بعد حاضری کا پروگرام بنایا تھا۔ اِدھر قافلے واپس آنا شروع ہوئے اُدھر میں نے سوئے اجمیر جانے کی ٹھانی' دلی سے جے پور کے لئے صبح چھ بجے ایک فلائٹ روانہ ہوتی ہے ہم بیس پچیس منٹ میں اس "گلابی شہر" کے ہوائی اڈے پر کھڑے تھے' جے پور کو "پنک سٹی" یا "گلابی شہر" اس لئے کہا جاتا ہے کہ اس کے بازاروں اور عمارتوں کا رنگ گلابی ہے' جے پور ریاست کے مہاراجہ کو یہ رنگ بے حد پسند تھا اس لئے ان کے حکم پر پورے شہر کو گلابی رنگ میں غسل دے دیا گیا تھا۔ بڑے بڑے خوبصورت دروازوں کے اندر ایک ہی انداز کی دکانیں آنکھوں کو بڑی بھلی لگتی ہیں۔ مہاراجہ کا رہائشی محل اب میوزیم میں تبدیل ہو چکا ہے البتہ اس کا ایک حصہ اب بھی ان کے اہلِ خاندان کی قیام گاہ کے طور پر استعمال ہوتا ہے۔ ایک بڑے محل میں تاج گروپ نے ہوٹل بنا رکھا ہے۔ ہوا محل بھی دیکھنے کی چیز ہے اس میں اتنے لاتعداد دروازے اور کھڑکیاں ہیں کہ آپ اس میں کھڑے ہوں تو یوں لگتا ہے جیسے کھلی ہوا اور فضا میں کھڑے ہیں۔ جنتر منتر کے نام سے ایک اور جگہ قابلِ دید ہے جس میں بڑی دوربینیں اور ستاروں اور سیاروں کو دیکھنے کے آلات نصب ہیں۔ ایئرپورٹ پر وزارتِ خارجہ کے پروٹوکول افسر مسٹر بساریہ میرا انتظار کر رہے تھے' یہاں سے ہم سرکٹ ہاؤس پہنچے جہاں ہمارے لئے کمرے ریزرو تھے' ناشتہ کیا اور پھر کار کے ذریعے اجمیر روانہ ہو گئے۔

شدید گرمی، راجستھان کا علاقہ اور پھر تپشِ شوق، چار ساڑھے چار گھنٹے کے اس سفر کے دوران اس سہ آتشہ گرمی نے جھلسا کر رکھ دیا وہی بات تھی کہ۔

گرمئی شوق بھی ہے گرمئی موسم بھی ہے
اور پھر اس پہ مرا سوزِ جگر کیا کہنا

مگر دربارِ خواجہؒ میں پہنچنے کی امنگ اتنی زوردار تھی کہ گرمی کا احساس تک نہیں ہوا یا شاید یہ بھی حضرتِ خواجہؒ کا تصرف تھا کہ وہ ابھی سے اپنے تن آسان مہمان کی خاطرداری فرما رہے تھے کوئی مولوی صاحب فتویٰ نہ لگادیں کہ میں شرک کا مرتکب ہو رہا ہوں یہ میرا ہی نظریہ نہیں توحید کے معاملے میں شمشیرِ برہنہ، امام ربانی مجدّد الف ثانی رحمتہ اللہ علیہ نے بھی اپنے مکتوبات میں سفرِ اجمیر کا ذکر کرتے ہوئے حضرت خواجہ کے تصرفات کا کچھ ایسا ہی تذکرہ کیا ہے، تیسری جلد میں مکتوب نمبر 104 میں لکھتے ہیں:۔

"آں مشکلے کہ داشتم آں معاملہ شاید در عالم مثال دریں ایام حل شدہ خافیہ نماند شاید دریں معنی روحانیت خواجہ معین الدینؒ را ہم مدخلے باشد"

(وہ مشکل جو مجھے درپیش تھی اس کا معاملہ انہی دنوں میں حل ہو گیا اور اس میں کوئی اخفانہ رہا شاید اس میں خواجہ معین الدین کی روحانیت کا بھی دخل ہے)

اجمیر کی پہاڑیاں نظر پڑیں تو تاریخ فلم کی مانند نگاہوں کے سامنے گھومنے لگی، تقریباً آٹھ سو سال پہلے کس طرح یہاں ایک فقیر درویشوں کی ایک جماعت کے ہمراہ پہنچا ہوگا یہ پتھورا رائے کے شعبدہ باز ہیں جو خدائی کرامتوں کے بالمقابل سجدے میں پڑے ہیں، یہ دھتکارے ہوئے، سماج کے ٹھکرائے ہوئے اچھوت ہیں جو خواجہ غریب نوازؒ کے دسترخوان پر بیٹھے کھانا کھا رہے ہیں، لیجئے یہ سلطان شہاب الدین محمد غوری کی سواری آن پہنچی وہ گھوڑے سے اُتر کر آپ کے ہاتھ پر بوسہ دے رہے ہیں اور اب لیجئے اپنے تربیت یافتہ شاگردوں کی جماعتوں کو حضرت خواجہؒ ہندوستان کے طول و عرض میں تبلیغِ اسلام کے لئے بھجوا رہے ہیں، اس شخص کو پہچانئے یہ تو سلطان شمس الدین التمش لگتا ہے، ارے یہ بھی آپ کی زلفِ گرہ گیر کا اسیر نکلا، اب اجمیر شہر کے اندر ایک قبر کا منظر چشمِ تخیّل کے سامنے ہے، کسی انگریز کا یہ تاثر ٹھیک ہی تو تھا کہ ہندوستان پر ایک قبر حکومت کر رہی ہے یہ جلال الدین اکبر بادشاہ اکبر آباد سے پیدل اجمیر چلا آ رہا ہے درگاہ کے لئے ایک دیگِ کلاں نذر کرتا ہے، یہ جہانگیر بادشاہ ہے جو حاضر ہو کر درویشوں اور اہلِ خانقاہ کے لئے دیگِ خورد نذر کر رہا ہے، یہ شاہجہاں ہے جو یہاں ایک عالیشان مسجد تعمیر کرا رہا ہے جو اب بھی شاہجہاں مسجد کے نام سے موسوم اپنے حُسنِ تعمیر کی بہار دکھا رہی ہے۔ اس مجاہد کو پہچانو یہ شیر شاہ سوری ہے کس طرح سراپا ادب و نیاز بنا خانقاہ میں داخل ہو رہا ہے اور یہ کون ہے؟ یہ اورنگ زیب عالمگیر ہے سخت پابندِ شرع اور زاہدِ خشک مگر کئی بار میر تقی میر کے الفاظ میں "اس بارگاہِ فلک اشتباہ میں" حاضری دے چکا ہے اور یہ ان مہاراجوں کی قطاریں دیکھئے یہ غیر مسلم والیانِ ریاست ہیں مگر خواجہ غریب نوازؒ سے ان کو

بھی عقیدت وارادت ہے اس لئے حصولِ برکت کی خاطر چلے آئے ہیں۔

اس تاریخی سرزمین پر قدم رکھ کر دل و دماغ کی جو حالت ہوئی وہ کچھ میں ہی جانتا ہوں ایسے لگا جیسے میں بھی اسی تاریخ کا ایک حصہ بن کر حضورِ خواجہؒ میں موجود ہوں، کم سے کم مزارِ مبارک پر پہنچ کر میری یہی حالت تھی، ہاتھ جو دعا کو اٹھائے بس اُٹھے ہی رہ گئے آنکھیں بند ہو گئیں اور میں تصوّر ہی تصور میں کہاں سے کہاں جا پہنچا کوئی ایک گھنٹے کے بعد ساتھیوں نے جھنجوڑا تو واپسی ہوئی، زہے نصیب! یہ لمحہ بھی مقدّر میں لکھا تھا کہ بقول اقبالؒ ؎

دلِ بیتاب جا پہنچا دیارِ پیرِ سنجر میں
میسّر ہے جہاں درمانِ دردِ ناشکیبائی

خانقاہ کا نظام موروثی طور پر چند خاندانوں کے سپرد چلا آ رہا ہے جنہیں "خدّام" کہتے ہیں اس وقت اجمیر شریف کے خدّام کی تعداد بارہ سو کے لگ بھگ ہے، یہ لوگ زائرین کے عطیات اور نذر و نیاز پر ہی گزاران کرتے ہیں اور بعض اوقات زائرین کو لے اُچکنے کے لئے ان میں بڑے دلچسپ مقابلے ہوتے ہیں۔ اسٹیشن پر ٹرین پہنچی تو "خدّام" زائرین کے استقبال کے لئے پہلے ہی موجود ہیں اور اب ایک ایک زائر کی باقاعدہ بولی دی جانے لگی ہے جس خادم نے زائر کو پانچ سو روپے میں خریدا ہے وہ پانچ سو روپے نکال کر خدّام کی ٹولی کے حوالے کر دیتا ہے اب زائر اس کے سپرد ہو گیا وہ اسے زیارات کرائے گا، اسے دعائیں پڑھوائے گا۔ ان ساری خدمات کے عوض اسے جو معاوضہ ملے گا اب یہ اس کی قسمت ہے وہ یہ سارا سودا پانچ سو روپے میں خرید چکا۔ ظاہر ہے اب کم سے کم ایک ہزار روپے زائر کی جیب سے نکلوائے گا تو تبھی کچھ بات بنے گی۔ خدّام کے ہاتھوں زندہ انسانوں کی نیلامی کے جو مناظر اجمیر میں نظر آتے ہیں وہ اس درگاہ کی روایات کے سراسر منافی ہیں، یہاں کی روایت غریب نوازی ہے، غریب سازی نہیں۔ اگر مسلم اوقاف درگاہ کے نظام کو اپنے ہاتھ میں لے لے اور خدّام کے باقاعدہ وظیفے باندھ دے تو ان حرکات کا سدِّباب ہو سکتا ہے لیکن مشکل یہ ہے کہ بھارتی حکومت اس طرح کا کوئی اقدام کرے گی تو شور مچ جائے گا کہ وہ مسلمانوں کی ایک عظیم درگاہ پر قبضہ جمانا چاہتی ہے، بہرحال جیسے بھی ہو مسلم تنظیموں اور بالخصوص بریلوی مکتبِ فکر کی جماعتوں اور عمائدین کو اصلاحِ احوال کے لئے کوئی نہ کوئی صورت ضرور نکالنی چاہئے۔ ان مناظر سے مجھ ایسے شخص کو جو تکلیف پہنچی سو پہنچی ڈر ہے کہ اس طرح کی باتوں سے حضرت خواجہ غریب نوازؒ کی روح مبارک کو بھی تکدّر ہوتا ہوگا۔ پاکستانی زائرین کی ایک جماعت بھی ہر سال عرس کے موقع پر اجمیر آتی ہے اب کے ایک مرکزی وزیر اس کے سربراہ تھے ذاتی طور پر تو ان کا یہ جذبہ قابلِ ستائش ہے کہ انہوں نے حصولِ روحانیت کے لئے اتنا لمبا سفر اختیار کیا مگر وزیر ہونے کے بعد کسی شخص کی سرگرمیاں ذاتی جذبے کے پیمانے سے نہیں ماپی جاتیں اس میں قومی اور حکومتی نقطۂ نظر سے بھی کئی پہلو محلِ نظر ہوتے ہیں، اب تک ہمارے ملک سے صرف حج وفد کے لئے کسی وزیر کو قائد بنایا جاتا رہا ہے سبب یہ ہے

کہ تمام مسلمان ملکوں کا یہی قاعدہ ہے مگر یہ پہلا موقع تھا کہ زائرین اجمیر کی قیادت بھی ایک مرکزی وزیر کو سونپی گئی اس سے ایک تو دوسرے زائرین کے حق کا اتلاف ہوا دوسرے پروٹوکول اور مراسم کے اعتبار سے ایک غیر ملک میں وزیر صاحب کے استقبال میں جس طرح سرد مہری دکھائی گئی اس سے ملک اور قوم کا وقار بھی متاثر ہوا' اس کا الزام میں بھارتی حکومت کو نہیں دیتا کہ وہ تو زائرین کا استقبال کر رہی تھی کسی وزیر کا نہیں لیکن امر واقعہ یہی تھا کہ حکومتِ پاکستان کا ایک مرکزی وزیر بنفسِ نفیس زائرین کی قیادت کر رہا تھا اس سے ہماری اپنی حکومت اور ملک کے احترام میں فرق آیا۔

پاکستانی سفارت خانہ بار بار حکومتِ ہند کو متوجہ کر رہا تھا کہ وزیر صاحب ان ان اوقات پر امرتسر' دلی اور اجمیر کے اسٹیشنوں پر قدم رنجہ فرمائیں گے مگر ہوا کیا' امرتسر اسٹیشن پر ایک نائب تحصیلدار ان کے استقبال کے لئے تشریف لائے' دلّی میں بار بار کی یاد دہانیوں کے باوجود ایک میونسپل کونسلر نے زحمت فرمائی اور اجمیر اسٹیشن پر ریلوے اسٹیشن ماسٹر اور ایک اسسٹنٹ کلکٹر نے ان کا خیر مقدم کیا۔ کاش کہ وزیر صاحب جذبۂ زیارت کو اس وقت تک کے لئے اٹھا رکھتے جب وہ وزارت سے سبکدوش ہو جاتے یا پھر سرکاری حیثیت ہی میں جانا ضروری تھا تو عرس کے علاوہ دوسرے ایام میں چلے جاتے کہ بھارتی حکومت پروٹوکول کے مطابق ان کا استقبال کر سکتی یا پھر انہیں بے نفسی ہی کا مظاہرہ کرنا تھا تو عام زائر بنتے اور زائرین کی قیادت کسی اور کے سپرد کر دیتے' یہ چھوٹے چھوٹے مناصب بھی عام آدمیوں کو نہ دینے کا طریق کار مستحسن نہیں' اس "مرکزیت" کے نتیجے میں ملک اور قوم کی جو بے وقری ہوئی اس سے حساس پاکستانی قلبی تکلیف محسوس کرتے ہیں' مجھے خوش گمانی ہے کہ یہ سارا کچھ صدر جنرل محمد ضیاء الحق کی منظوری سے نہیں ہوا ہو گا' جمہوری حکومت ہوتی تو یہ مسئلہ پارلیمنٹ میں اٹھتا اور وزیر صاحب کی وساطت سے ملک اور قوم کی جو بے احترامی ہوئی اس پر انہیں استعفیٰ ہی دیتے بنتی۔

دہلی کی چند محفلیں

بھارت پہنچتے ہی بمبئی کے مشہور انگریزی اخبار "سنڈے آبزرور" نے میرا ایک انٹرویو شائع کر دیا تھا اور اس طرح دہلی کے علمی، سیاسی اور ادبی حلقوں میں میرے "ورودِ ہند" کی اطلاع پہنچ چکی تھی، بہت سے احباب پتہ نکالتے نکالتے خود ہی میرے ہوٹل پہنچ گئے، انہی میں بھارت کی مایۂ ناز شخصیت اور برادرم جناب حکیم محمد سعید دہلوی کے برادرِ بزرگ جناب حکیم عبدالحمید دہلوی بھی تھے۔ حکیم صاحب محترم کے دفتر میں مَیں نے فون کر دیا تھا مگر بعد میں مَیں آگرہ اور اجمیر شریف چلا گیا۔ حکیم صاحب برابر فون کرتے رہے یہاں تک کہ خود بھی تشریف لائے مگر میں موجود نہ تھا۔ واپسی پر ہوٹل کے استقبالیہ نے ان کے "پیغامات" دیئے تو مجھے ان کی زحمت کا خیال کر کے سخت افسوس ہوا، سوچا تلافی کے لئے خود ہی حاضر ہو جاؤں مگر حکیم صاحب جو سراپا اخلاق اور مروّت ہیں کہاں برداشت کرتے فون کیا تو فرمایا "میں ہی آؤں گا" تشریف لائے اور اگلے دن اپنے دولت کدے پر عشائیہ کے لئے مدعو کر گئے۔

عشائیہ میں حکیم صاحب نے لذتِ کام و دہن کے لئے تو انواع و اقسام کے کھانے تیار کرائے ہی تھے۔ کرم بالائے کرم یہ کہ میری روحانی تواضع کے لئے بھارت کی بہت سی ممتاز شخصیات کو بھی اپنے دسترخوان پر بھیج بلایا تاکہ ان سے تبادلۂ خیال ہو، وہ مجھ سے پاکستان کے احوال سنیں اور میں ان سے بھارتی مسلمانوں کے حال اور مستقبل پر گفتگو کر سکوں۔ اس عشائیہ میں جن اکابر سے ملاقات ہوئی ان میں جنتا پارٹی کے سیکرٹری جنرل اور مشہور مسلم دانشور اور سیاستدان سیّد شہاب الدین، مولانا ابواللیث

اصلاحی ندوی امیرِ جماعت اسلامی ہند، جناب سیّد حامد وائس چانسلر علی گڑھ یونیورسٹی، مسٹر بدرالدین طیّب.جی سابق وائس چانسلر مسلم یونیورسٹی، جناب ابراہیم سلیمان سیٹھ صدر انڈیا مسلم لیگ، سیّد احمد ہاشمی ممبر پارلیمینٹ، مولانا سجاد حسین میرٹھی صدر مدرسئہ عالیہ فتح پور، پروفیسر اے ایم خسرو ممبر پلاننگ کمیشن، سیّد اوصاف علی ڈائریکٹر اسلامک ریسرچ انسٹیٹیوٹ، خواجہ حسن ثانی نظامی اور بہت سے دوسرے علماء، دانشور اور فلسفی شامل تھے۔

اگلے دن "غالبؔ اکیڈمی" میں میرے اعزاز میں ایک مشاعرہ منعقد ہوا۔ مشاعرے کے لئے جو دعوت نامہ شائع کیا گیا تھا، اس پر "الداعیان" کی حیثیت سے اردو ادب کی کئی تنظیموں کے نام درج تھے۔ اس سے اندازہ ہوا کہ دہلی میں بھی شعری اور ادبی سرگرمیاں ہمارے ہاں سے کچھ کم نہیں۔ ان تنظیموں کے نام آپ بھی سنیں۔

(1) انجمن ترقیٔ اردو۔ (2) بزمِ احباب۔ (3) بزمِ ساز و ادب۔ (4) بزمِ یادگارِ انیسؔ۔ (5) مرکزِ علم و دانش۔

مشاعرے کی صدارت اردو کے مشہور ادیب اور نقّاد اور جامعۂ ملیّہ دہلی میں شعبۂ اردو کے سربراہ پنڈت گوپی چند نارنگ فرما رہے تھے جو ہندوستان کی طرح پاکستان میں بھی یکساں معروف و مقبول ہیں۔ غالبؔ اکیڈمی کے سیکرٹری جناب ذہین نقوی بدقسمتی سے اسی دن ایک حادثے میں زخمی ہو گئے تھے اور ہسپتال میں داخل تھے ان کی جگہ سٹیج سیکرٹری کے فرائض جناب رئیس مرزا اور واجد سحری نے ادا کئے۔ ہال کے زیریں اور بالائی دونوں حصے حاضرین سے پُر تھے بہت سے لوگ جگہ نہ ملنے کی وجہ سے دروازوں میں کھڑے تھے۔ سٹیج پر میرے اور صاحبِ صدر کے علاوہ حکیم عبدالحمید دہلوی اور خواجہ حسن ثانی نظامی بھی تشریف فرما تھے۔ سب سے پہلے استقبالیہ کارروائی شروع ہوئی، مختلف انجمنوں کا نام پکارا جاتا اور ان کے نمائندے باری باری مہمانِ خصوصی کے گلے میں پھولوں کے ہار ڈالتے جاتے۔ گل پوشی کا یہ مرحلہ ختم ہوا تو خواجہ حسن ثانی نے تعارفی تقریر کی اور اس کے بعد پنڈت گوپی چند نارنگ نے صدارتی کلمات ارشاد فرمائے۔ نارنگ صاحب کا نام تو میں نے بہت سن رکھا تھا لیکن ان سے بالمشافہ ملنے اور ان کے خیالات سننے کا پہلا اتفاق تھا۔ مجھے اعتراف کرنا چاہئے کہ میں نے آج تک کسی ادیب اور شاعر کی اتنی اچھی تقریر نہیں سنی تھی۔ سیاستدانوں، واعظوں، عوامی خطیبوں اور پارلیمانی مقرروں کی بات دوسری ہے، اپنے اپنے میدانوں میں ان کی جولانیٔ طبع کا انداز جُداگانہ ہے لیکن نارنگ صاحب نے جس شُستہ اور شیریں ادبی پیرائے میں بے حد سنبھل کر صحیح اور مناسب انتخابِ الفاظ کے ساتھ اظہارِ خیال کیا۔ وہ گفتگو اور تقریر کے درمیان کی ایک صنف تھی اور تاثیر اور ابلاغ کے لحاظ سے بلا مبالغہ منفرد، نارنگ صاحب کے بعد مشاعرے کا باقاعدہ آغاز ہوا اور دہلی کے ممتاز اور مشہور ہندو اور مسلم شُعرا نے اپنے کلامِ بلاغت نظام سے سامعین کو نوازا، میں یہ کلام سن رہا تھا اور سوچ رہا تھا کہ جس ملک میں اردو کے ایسے ایسے خوش گو شاعر پائے جاتے

ہوں وہاں سے اردو کو دیس نکالا کیسے دیا جاسکتا ہے؟ اردو زبان کی فلمیں اس کے علاوہ ہیں جو بھارت میں ہر دوسری زبان کی فلموں سے بڑھ کر کامیاب اور مقبول ہیں اور غزل کی گائیکی یہاں اتنی ہر دلعزیز ہے کہ بھارتی ثقافت اس کے بغیر مکمل نہیں سمجھی جاتی۔ دہلی کا شاید ہی کوئی ہندو گھرانہ ہو جس میں غلام علی اور مہدی حسن کی غزلوں کے کیسٹ پورے ذوق و شوق سے نہ سُنے جاتے ہوں۔ اردو شاعری ہندی بولنے والوں میں بھی اتنی مقبول ہے کہ مشہور شعرأ کے دیوان ان کی سہولت کے لئے ہندی رسم الخط میں شائع کئے گئے ہیں۔

مشاعرے میں پڑھنے والے کئی شاعر نوخیز اور نوجوان بھی تھے اس سے اندازہ ہوا کہ اردو شاعری نئی اور پُرانی دونوں نسلوں میں یکساں اپنی اپیل رکھتی ہے۔ مشاعرے کے ایک بزرگ ہندو شاعر کا تذکرہ اور نمونہ کلام پیش کئے بغیر بات مکمل نہ ہوگی یہ شاعر پنڈت گلزار دہلوی تھے جو اپنے سرخ و سفید رنگ ' اپنی دبنگ آواز اور اردو زبان سے اپنی روح پرور اور جذبہ آفریں عقیدت کی وجہ سے پورے مشاعرے پر چھائے رہے۔ ایک ہندو شاعر کی زبان سے اردو کی ایسی ولولہ انگیز وکالت سن کر بے حد حیرت بھی ہوئی اور مسرت بھی۔ پنڈت جی حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء رحمتہ اللہ علیہ سے بھی والہانہ عقیدت رکھتے ہیں اور اس نسبت سے پنڈت صوفی گلزار نظامی دہلوی کہلاتے ہیں ' خود بھی اپنے نام کے ساتھ یہی لاحقے اور سابقے لگاتے ہیں چنانچہ بعد میں مجھے جو خط لکھا اس پر ان کا نام اسی طرح تحریر تھا'' پنڈت صوفی گلزار نظامی'' رباعیاں تالیوں کی گونج میں سنی گئیں۔

مضموں ہیں گہر فکر جواں ہے میری
کوثر میں ڈھلی طرزِ بیاں ہے میری
دلّی جسے کہتے ہیں وطن ہے میرا
اردو جسے کہتے ہیں زبان ہے میری

بھارت ہی کی بیٹی ہے زبانِ اردو
کیوں تیغِ تعصّب سے کرو اس کو دو نیم
جمہوریّت خاص کے دعوےٰ دارو
عالمؔ میں کہیں عِلم ہُوا ہے تقسیم

دنیا میں تو اونچا ہے کلامِ اردو
عقبیٰ میں بھی اونچا رہے نامِ اردو
جب حشر میں ہو نام شمارِیٔ آقا

میں وہ ہندو ہوں کہ نازاں ہیں مسلماں جس پر
دل میں کعبہ ہے مرے، دل ہے صنم خانوں میں
جوؔش کا قول ہے اور اپنا عقیدہ گلزاؔر
"ہم سا کافر کوئی اُٹھا نہ مسلمانوں میں"

اردو پہ جو یورش ہے پڑے گی مہنگی
پیدا نئے ہر روز کے دُکھڑے ہوں گے
گر یُوں ہی زبانوں کے کرو گے ٹکڑے
خاکم بدہن قوم کے ٹکڑے ہوں گے

خواجۂ خواجگان کے خادم
چشتیہ خاندان کے خادم!
جس کے بانی امیر خسروؔ تھے
ہم ہیں اردو زبان کے خادم

مشاعرہ ختم ہوا تو میری تقریر کا اعلان ہوا اور پھر پندرہ بیس منٹ کے خطاب کے بعد میں نے اپنا کلام پیش کیا۔ مجمع کی نکتہ نوازی و نکتہ سنجی اور قدردانی و ہمت افزائی کا عالم یہ تھا کہ میں نے دس غزلیں سنا ڈالیں لیکن ابھی تک "ہل من مزید" کی صدائیں بلند ہو رہی تھیں۔ آخر میں صاحبِ صدر نے خطبہ اختتامیہ دیا اور اس طرح یہ یادگار تقریب اختتام کو پہنچی۔

دہلی کے خادمانِ اردو کی صف میں "شمع" کے مالک و مدیر جناب یونس دہلوی کا نام شمار نہ کرنا زیادتی کی بات ہوگی۔ "شمع" اصلاً فلمی پرچہ ہے لیکن اپنے ہر شمارے میں دو چار غزلیں اور افسانے شائع کر کے اردو ادب کی برابر خدمت کر رہا ہے۔ اس کا اجراء سالوں پہلے جناب یوسف دہلوی نے کیا تھا اور اب جناب یونس دہلوی اپنی انتظامی مہارت سے اسے چار چاند لگائے ہوئے ہیں' ان کے چھوٹے بھائی جناب ادریس دہلوی اس میں اپنے قلمی نام سے جو فلمی کالم لکھتے ہیں وہ خاصے کی چیز ہے شمع کے ساتھ ساتھ اس گھرانے نے بچوں کے لئے ایک رسالہ "کھلونا" اور خواتین کے لئے ایک ماہنامہ "بانو" بھی جاری کر رکھا ہے۔ "بانو" کی ادارت جناب یونس دہلوی کی لائق اور با اخلاق بیگم زینت دہلوی اپنی ہونہار بیٹی سعدیہ کی مدد سے انجام دیتی ہیں۔

جناب یونس دہلوی بھی میرے اعزاز میں ایک بڑا ڈنر دینا چاہتے تھے مگر میں نے انہیں بالاصرار اس ارادے سے باز رکھا اور اس کی جگہ انہیں ایک خالص "فیملی ڈنر" دینے پر رضامند کر لیا۔

مشاعرے کے بعد یونس دہلوی اپنی گاڑی میں سیدھے ہمیں اپنے گھر لے گئے جہاں تینوں بھائی ایک ساتھ بڑے اتحاد اور یگانگت کے ساتھ زندگی گذار رہے ہیں یوں تو ماشاءاللہ ان کا گھر بھی بہت کشادہ ہے لیکن اصل کشادگی ان کے اپنے دلوں میں پائی جاتی ہے۔

یہاں جناب ادریس دہلوی اور جناب الیاس اپنی بیگمات کے ساتھ ہمارا انتظار کر رہے تھے۔ زینت دہلوی اور ان کی ملنسار صاحبزادی سعدیہ بھی موجود تھیں دسترخوان بچھا تو خالص دلّی کے ذائقہ دار کھانے' کبابوں سے لے کر دال تک ہر چیز کا لطف آ گیا اور اس لطف سے بھی بڑھ کر وہ خالص گھریلو ماحول مزا دے گیا جو اس پوری دعوت میں کارفرما تھا۔ بڑی بڑی رسمی ضیافتوں میں وہ بات کہاں جو اس طرح کی خالص گھریلو طرز کی دعوتوں میں ہوتی ہے۔ کھانے کے بعد حضارِ محفل کے اصرار پر مجھے یہاں بھی اپنا کلام سنانا پڑا۔ سیاست کے جھمیلوں' خطیبانہ مصروفیتوں' صحافیانہ تحریروں اور مذہبی تقریروں نے اب تو ربع صدی سے شعر و شاعری کی محفلوں سے الگ تھلگ کر رکھا ہے ورنہ ایک زمانہ تھا (اور ظاہر ہے یہ زمانہ آتش کی جوانی کا زمانہ تھا) کہ ہمارا اشمار بھی شاعروں میں ہوا کرتا تھا' دلّی کی ان محفلوں میں شریک ہو کر ایسا لگا جیسے وہی دَور پھر سے پلٹ آیا ہے۔ لاچار دو چار غزلیں سنائیں۔ حیرت اس پر ہوئی جب محترمہ زینت دہلوی اور ان کے شوہرِ نامدار نے نعت سنانے کی فرمائش کی' یہ تو بعد میں معلوم ہوا کہ فلمی رسالہ نکالنے کے باوجود دونوں میاں بیوی بلکہ صاحبزادی بھی بڑا گہرا مذہبی ذوق رکھتے ہیں اور کراچی کے بزرگ حضرت فاروق رحمانیؒ سے جن کا ابھی حال ہی میں انتقال ہوا ہے باقاعدہ بیعت بھی ہیں' سچ ہے

یہ اُس کی دین ہے جسے پروردگار دے

دہلی کی عظیم الشان جواہر لال نہرو یونیورسٹی دیکھنے کا بھی موقع ملا۔ اس کے "سکول آف ایشین اسٹڈیز" نے مجھے طلبہ اور اساتذہ سے خطاب کرنے کی دعوت دی تھی میری گفتگو کا موضوع "جنوب مشرقی ایشیا کے تناظر میں پاکستان کی صورتحال" تھا جن اہلِ علم کو بیرون ملک کسی ایسے نازک موضوع پر اظہارِ خیال کا اتفاق ہوا ہو وہی جان سکتے ہیں کہ دیارِ غیر میں اپنے ملک کے کمزور اور بعض اختلافی گوشوں پر روشنی ڈالنا کتنا کٹھن اور جاں گُسل کام ہوتا ہے پھر مشکل یہ ہے کہ علمی دیانت کتمانِ حق بھی نہیں کرنے دیتی۔ سو یہ تقریر کیا تھی اچھا خاصا پلِ صراط تھی جس پر کوئی پون گھنٹہ مجھے پھونک پھونک کر قدم رکھنا پڑا بعد میں اتنا ہی وقت سوال جواب کے لئے مخصوص تھا۔ طلبہ اور اساتذہ نے یکساں اس میں حصہ لیا۔ ایسے ایسے سوالات کئے کہ چکر آ گیا۔ انہیں پاکستان کی تاریخ' سیاسی جماعتوں اور شخصیات کے بارے میں اتنا کچھ معلوم تھا کہ خود ہمارے ہاں کم لوگ اتنے باخبر ہوں گے مگر خدا کا شکر ہے میں کسی سوال میں

لاجواب نہیں ہوا' کسی سوال پر سائل کو مطمئن کیا تو کسی پر کم سے کم اسے خموش ضرور کر دیا۔ ایک بات سے حیرت ہوئی...... طلبہ اور طالبات میں سے کئی نے سیاست میں تشدّد کی حمایت کی میں نے اس کا ردّ کیا تو ایک دو اساتذہ ان کی کمک کو آ گئے۔ میں نے بین الاقوامی سیاست کے پسِ منظر میں تشدّد کے استعمال کے نتائج پیش کئے اور برِّ صغیر کی تاریخ میں اس کے قبول و عدم قبول کا جائزہ لیا تب کہیں جا کر بحث رکی۔ نوجوان نسل جمہوری جدّوجہد سے مایوس ہو کر تشدّد کو بطور طریقِ کار اختیار کرنے کی حامی کیوں بنتی جا رہی ہے۔ بھارتی رہنماؤں کو اپنے جمہوری سسٹم کے خوب و ناخوب میں اس کا جواب تلاش کرنا چاہیے۔

ایک سوال جسے سن کر میرے سینے میں ہُوک سی اٹھی اور اس کے وجوہ و اسباب جانتے ہوئے بھی میں حرفِ برہنہ نہ کہہ سکا صرف پارلیمانی حاضر جوابی سے کام لے کر حاضرین کے چہروں پر مسکراہٹیں ہی بکھیر کر رہ گیا۔ یہ تھا کہ "برّ صغیر کو ایک ساتھ آزادی ملی لیکن اس کی کیا وجہ ہے کہ بھارت میں تو دنیا کی سب سے بڑی جمہوریت قائم ہے یہاں کئی عام انتخابات ہو چکے ہیں۔ عام آدمی کو یقین ہے کہ وہ بیلٹ سے حکومت کو بدل سکتا ہے لیکن پاکستان میں تین مارشل لاء لگ چکے ہیں۔ عام انتخابات منعقد نہیں ہوئے تو ان کا اچھا نتیجہ برآمد نہیں ہوا عام آدمی یہ سمجھتا ہے کہ یہاں حکومت بیلٹ سے نہیں بلٹ سے تبدیل ہوتی ہے"۔ کاش! اپنا ملک ہوتا' سیاسی آزادی ہوتی تو میں کھل کر اس موضوع پر بولتا دوسرے ملک میں اپنے ہی گریبان کی دھجیاں کیسے بکھیرتا اور اپنے ہی سینے کے داغ کیا دکھاتا؟۔

چند ملاقاتیں

ایک دن اسلامک ریسرچ انسٹیٹیوٹ کے ڈائریکٹر سید اوصاف علی نے اپنے اسکالرز سے خطاب کرنے کی دعوت دی۔ یہ ادارہ بھی حکیم عبدالحمید دہلوی کے ہمدرد ٹرسٹ نے قائم کیا ہے، اور دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ تیس ایکڑ کا تو اس کا کیمپس ہے، مرکزی عمارت کا کورڈ ایریا تقریباً پونے دو لاکھ مربع فٹ ہے اور اس کا ڈیزائن مشہور آرکیٹیکٹ جناب فیاض الدین نے بنایا ہے، جو مکّہ اور مدینہ میں حرمین شریفین کے توسیعی کام میں شریک رہنے کی بھی سعادت حاصل کر چکے ہیں۔ عمارت کیا ہے اسلامی فنِ تعمیر کا نمونہ ہے اور فراخیٔ قلبِ مسلم کی جیتی جاگتی مثال، تنہا انسٹیٹیوٹ کی تعمیر پر تقریباً ڈیڑھ کروڑ روپے خرچ آئے ہیں اور ابھی تو منصوبے میں مرکزی لائبریری، میوزیم، کالجز، ہوسٹل، ریسرچ کے مختلف شعبہ جات اور مسجد کی عمارات بھی شامل ہیں۔ ان سب پر مل کر کتنا خرچ آیا ہوگا خود ہی اندازہ لگا لیجئے۔ لائبریری کے بارے میں منتظمین کا عزم یہ ہے کہ اسے دنیا کی سب سے بڑی اسلامی لائبریری بنا کے دم لیں گے۔ دنیا کی مختلف زبانوں میں بیس لاکھ کتابیں جمع کرنے کا پروگرام ہے۔ ادارہ کے زیرِ اہتمام 64ء سے انگریزی زبان میں ایک بلند پایہ سہ ماہی جریدہ بھی شائع ہوتا ہے جسے "اسٹڈیز ان اسلام" کا نام دیا گیا ہے۔ بعض دوسری معیاری مطبوعات اس کے علاوہ ہیں جو عربی اور انگریزی میں شائع ہوئی ہیں اور دنیا بھر کے علمی حلقوں میں مقبول ہیں۔

میں پہنچا تو ادارے کے شاندار کانفرنس روم میں اسکالر حضرات میرا انتظار کر رہے تھے، کچھ اہلِ

علم دوسری یونیورسٹیوں سے بھی تشریف لائے تھے میری ابتدائی گفتگو کے بعد سوال جواب کی محفل شروع ہوئی جو زلفِ یار کی طرح دراز ہی ہوتی چلی گئی' ذاتی نوعیت کے سوالوں سے لے کر سیاسی' علمی اور دینی ہر موضوع پر استفسارات ہوئے۔ بعض پر شرکاء کے درمیان تبادلۂ خیال کی بھی نوبت آئی اور اسی طرح کوئی دو گھنٹے تک یہ پُرمغز مجلس جاری رہی۔ بعد میں مجھے مرکز کے مختلف شعبہ جات کا معائنہ کرایا گیا تغلق آباد کی اس علمی بستی کا میرے دل و دماغ نے جو اثر قبول کیا اس کا اظہار میں نے لاگ بک پر اپنے تاثرات رقم کرتے ہوئے اقبال ؒ کے اس شعر کی صورت میں کیا۔

کریں گے اہلِ نظر تازہ بستیاں آباد
میری نگاہ نہیں سوئے کوفہ و بغداد

پاکستان کے سفیر متعینہ بھارت جناب ریاض پراچہ نے بھی لنچ پر بلایا' ان دنوں ان کے تبادلے کے احکام آ چکے تھے اور وہ واپس اسلام آباد جانے کی تیاریوں میں مصروف تھے۔ پراچہ صاحب سیکرٹری بھی رہ چکے ہیں اور ان کا شمار پاکستانی محکمہ امورِ خارجہ کے قابل اور اعلیٰ ترین حکام میں ہوتا ہے۔ یہاں کا سفارت خانہ بھی قابلِ دید ہے۔ دنیا میں شاید ہی کسی دوسری جگہ کسی پاکستانی سفارت خانے کے پاس اتنی اچھی عمارت اور اتنی وسیع جگہ ہوگی۔ پاکستان ہاؤس ہی کے احاطے میں سفارت خانہ کے افسران اور دوسرے ملازمین کے مکانات ہیں۔ یہیں پاکستانی بچوں کے لئے سکول بھی واقع ہے اور ایک اچھا خاصا ہسپتال بھی۔ صرف پاکستانی سفیر کی قیام گاہ یہاں سے باہر اس عالیشان کوٹھی میں ہے جو پاکستان کے پہلے وزیر اعظم جناب لیاقت علی خان مرحوم کی قیام گاہ تھی اور جو "گلِ رعنا" کے نام سے مشہور و معروف ہے۔ پراچہ صاحب نے اپنے گھر سے جاتے ہوئے راستے میں وہ کوٹھی دکھائی جہاں قائد اعظم محمد علی جناحؒ رہائش پذیر رہے۔ باہر سے یہ گھر خوبصورت اور باوقار نظر آیا۔

لنچ پر آل انڈیا مسلم لیگ کے صدر سیٹھ سلیمان یوسف اور بعض وہ ممبران پارلیمنٹ بھی تھے جو ابھی حال ہی میں پاکستان کا دورہ کر چکے ہیں۔ یہ سب حضرات پاکستان سے بڑی اچھی یادیں لے کر لوٹے ہیں۔ دیر تک اپنے دورے کے تاثرات بیان کرتے رہے۔

دہلی میں متعین اے پی پی کے نمائندے جناب حفیظ الرحمٰن نے بھی کرم فرمایا' وہ میرے اعزاز میں لنچ یا ڈنر دینا چاہتے تھے مگر میں پہلے ہی سے چھوٹی بڑی دعوتوں کے اتنے وعدے کر چکا تھا کہ اس کیلئے وقت نہ تھا۔ اتنے بار بار کے اصرار پر یہ درمیانی راستہ سمجھ میں آیا کہ کسی دن صبح ان کے ہاں نہاری کا ناشتہ کیا جائے۔ پرانی دلی کی نہاری کی میں بہت تعریف سن چکا تھا سوچا اس طرح حفیظ صاحب کی بات بھی رہ جائے گی اور میرا دیرینہ شوق بھی پورا ہو جائے گا۔ حفیظ صاحب کو میں نے زیادہ لوگ بلانے سے منع کر دیا تھا دعوت میں صرف جناب حسن عسکری تھے جو سفارت خانے میں پریس اتاشی کے فرائض انجام دے رہے ہیں اور مشہور پاکستانی صحافی جناب حسن اختر اور ہماری "اسماء خالہ" یعنی بیگم طیب حسین کے بھائی ہیں یا

پھر مسٹر اشفاق گوندل جو محکمہ اطلاعات ہی کے افسر ہیں اور ایک زمانے میں میرے ساتھ بحیثیت پی آر او کام کر چکے ہیں۔ نہاری جملہ لوازمات کے ساتھ میز پر چُنی گئی اور تھی بھی بہت لذیز مگر مجھے نہ جانے کیوں اندرون لوہاری دروازہ لاہور میں اپنے حاجی صاحب کی نہاری یاد آتی رہی۔ واقعہ یہ ہے کہ میں اب تک یہ فیصلہ نہیں کر سکا کہ جامع مسجد دہلی کے قریب بننے والی یہ نہاری زیادہ اچھی ہے یا لاہور میں ہمارے حاجی صاحب کی، ویسے بھی پرانی دلّی اور پرانے لاہور کے گلی کوچے اور مکانات ایک سے ہیں۔ جامع مسجد کے قریب سے اندرونِ شہر داخل ہو جاؤ تو یوں لگتا ہے جیسے موچی دروازہ اور لوہاری دروازہ میں پھر رہے ہیں نہاری میں بھی مشابہت پائی تو بے اختیار زبان سے نکل گیا۔

دلّی میں ہے لاہور تو لاہور میں دلّی

"انڈین پریس ٹرسٹ" کے نمائندے مسٹر ڈھر میرا انٹرویو لے چکے تھے اور وہ اخبارات میں بہت نمایاں حیثیت سے شائع ہو چکا تھا۔ دوسرے اخبارات بھی انفرادی طور پر میرا انٹرویو لے رہے تھے۔ نئی دلّی کے مشہور ہفت روزہ "نئی دنیا" کے ایڈیٹر بھی اس مقصد کے لئے تشریف لا چکے تھے۔ ریڈیو، ٹی وی سے بھی میرے بیانات نشر ہو رہے تھے مگر میں نے مناسب سمجھا کہ ایک باقاعدہ پریس کانفرنس سے خطاب کر لوں چنانچہ "حیات ایجنسی" میں جہاں میں ٹھہرا ہوا تھا اخباری نمائندوں کو میں نے چائے پر مدعو کر لیا۔ بھارتی پریس کاملاً آزاد اور خاصا مضبوط ہے۔

اردو صحافت تو اتنی جاندار نہیں مگر انگریزی اخبارات وسیع الاشاعت بھی ہیں اور معیاری بھی۔ ٹائمز آف انڈیا، ہندوستان ٹائمز، اسٹیٹسمین اور انڈین ایکسپریس اپنے گیٹ اپ ہی میں جاذب نظر نہیں مشمولات اور مندرجات کے لحاظ سے بھی دلکش ہیں۔ ٹائمز آف انڈیا کے فاضل ایڈیٹر شری گری لال جین ایک زمانے میں اندرا گاندھی کے زبردست ناقد تھے مگر آج کل ان کے ہم نوا ہیں مگر اس قدر بھی نہیں کہ ہر جا و بیجا بات میں ان کا ساتھ دیں، ان کے اداریوں کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ حکومت انہیں پڑھ کر اپنی پالیسی وضع کرتی ہے، صحافت کے ایک اور شعبہ میں بھی بھارت نے بے حد ترقی کی ہے وہ ہے انگریزی میگزین اور جرائد کا شعبہ۔ ایسے ایسے خوبصورت ہفتہ وار، پندرہ روزہ اور ماہوار رسالے شائع ہوتے ہیں کہ انہیں دیکھ کر ہی طبیعت خوش ہو جائے۔ مقبول فلمی جریدے اس کے علاوہ ہیں یہ بھی لاکھوں کی تعداد میں چھپتے اور دنیا بھر میں (جہاں جہاں اردو ہندی فلم دیکھی جاتی ہے) شوق سے پڑھے جاتے ہیں۔

پریس کانفرنس توقع سے بڑھ کر بھرپور اور پُر ہجوم تھی یہ پہلا موقع تھا کہ کوئی آزاد پاکستانی سیاستدان نئی دہلی میں کسی پریس کانفرنس سے خطاب کر رہا تھا۔ آزادی کے بعد سے ہمارے سرکاری وفود تو جاتے رہے ہیں اور ہمارے وزرائے خارجہ نے پریس کانفرنسیں بھی کی ہیں مگر غیر سرکاری حیثیت میں کسی سیاستدان نے اخباری نمائندوں سے اجتماعی تبادلۂ خیال اب تک نہیں کیا تھا۔ میں نے پہلے ایک تحریری

بیان پڑھا جس میں پاک بھارت تعلقات کی بہتری کی خواہش ' پاکستانی عوام کی طرف سے دوستی اور خیر سگالی کا پیغام ' حکومت پاکستان کی "نووار پیکٹ" کی پیشکش کی حمایت وغیرہ موضوعات شامل تھے اور اس کے بعد پریس کو سوالات کی دعوت دی' سوالات بوقلموں تھے۔ مسٹر بھٹو مرحوم اور کالعدم پیپلز پارٹی کی سیاست سے لے کر مقبول بٹ مرحوم اور ایٹم بم سازی تک ہر بات پوچھ ڈالی گئی۔ میں بفضلِ خدا پوری طرح تیار تھا خدا کا شکر ہے کسی اخبار کو سکینڈل بنانے کا موقع نہیں ملا۔ ویسے بھی یہ تمام تر سینئر صحافی تھے اور دیانتدارانہ صحافت کے آداب جانتے تھے یہی وجہ ہے کہ اگلے دن اہتمام سے میری پریس کانفرنس شائع ہوئی اور مجھے کسی اخبار سے بھی غلط رپورٹنگ کی شکایت پیدا نہیں ہوئی۔

وزیر اعظم اندرا گاندھی سے ملنا میرے پروگرام میں شامل تھا مگر وہ میرے جاتے ہی عرب ملکوں کے دورے پر روانہ ہو گئیں اور جب واپس آئیں تو اندرونِ ملک کسی صوبے میں چلی گئیں۔ معلوم نہیں صدر ذیل سنگھ سے ملنے کا خیال مجھے کیوں نہیں آیا۔ شاید تحت الشعور میں یہ ہو گا کہ وہ ایک آئینی سربراہ ہیں اور بس۔ البتہ وزارتِ خارجہ کے سیکرٹری مسٹر رس گوترہ اور وزیر مسٹر نرسیماراؤ سے ملاقات رہی اور کافی تفصیلی ملاقات رہی۔ وزارتِ خارجہ کے ایک ایڈیشنل سیکرٹری مسٹر ایس کے لامبے ہیں' کئی سال اسلام آباد میں بھارت کے سفارت خانہ میں کام کر چکے ہیں ان سے بھی دیرینہ آشنائی تھی۔ اصلاً پشاور کے رہنے والے ہیں اور بڑی محبّت اور لیاقت کے آدمی ہیں وہ اور ان کے ڈائریکٹر مسٹر ترپاٹھی بھی خلوص سے ملے۔ رسگوترہ صاحب گورنمنٹ کالج لاہور کے تعلیم یافتہ ہیں اور ہندی زبان کے شاعر اور ادیب بھی ہیں بڑی شُستہ اردو بولتے ہیں بڑے تپاک سے ملے اور دیر تک پاک بھارت تعلقات کے مختلف پہلوؤں پر گفتگو کرتے رہے۔ میں نے ان مشکلات کا ذکر کیا جو بھارت کا ویزا حاصل کرنے کے بعد پاکستانی شہریوں کو یہاں کے پولیس اسٹیشنوں میں رپورٹ کرتے وقت پیش آتی ہیں (میں خود تو اس طرح کی ہر رپورٹ سے مستثنیٰ تھا لیکن دہلی ہی میں بہت سے ایسے پاکستانی دوست ملے جنھوں نے بتایا کہ تھانوں میں ان کا پورا پورا دن ضائع ہو جاتا ہے) کہنے لگے' بدقسمتی سے آپ کے ہاں بھی یہی ہوتا ہے ہم تو کوشش کر رہے ہیں کہ یہ پابندیاں ختم ہوں اور دونوں ملکوں کے شہری نارمل طریقے پر آئیں جائیں مگر اس میں کچھ رکاوٹیں ہیں جنھیں دُور کرنے کے لئے پاک بھارت جوائنٹ کمیشن کے مذاکرات میں غور و خوض کیا جا رہا ہے۔

نرسیماراؤ سے ملاقات ہوئی تو وہ بھی بہت فصیح اردو بولنے والے نکلے۔ حیدر آباد دکن میں پڑھے ہیں اس لئے بے تکلف عربی اور فارسی کے الفاظ بھی دورانِ گفتگو استعمال کر جاتے ہیں ان سے دونوں ملکوں کی سیاسی صورتحال پر تبادلۂ خیال رہا۔

ان کے دفتر سے نکلے تو لامبے صاحب نے کہا آپ کے ایک اور دوست بھی قریب میں تشریف رکھتے ہیں ان سے بھی ملتے چلیں۔ ان کا اشارہ کنور نٹور سنگھ کی طرف تھا جو کئی سال تک پاکستان میں بھارت کے سفیر رہ چکے ہیں اور بڑے وضع دار اور نستعلیق آدمی ہیں۔ کچھ دیر ان سے بھی گپ شپ رہی

وہ بڑی محبت سے اسلام آباد میں اپنے زمانۂ قیام کی یادوں کا تذکرہ کرتے رہے۔ ایک صبح جنتا پارٹی کے سیکرٹری جنرل سیّد شہاب الدین کے دولت کدے پر بھی چائے پی۔ سیّد صاحب ایک ممتاز بہاری خاندان کے چشم وچراغ ہیں الجزائر میں بھارت کے سفیر بھی رہ چکے ہیں اور راجیہ سبھا کے ممبر کی حیثیت سے انہوں نے پارلیمانی حلقوں میں بڑی شہرت حاصل کی ہے۔ آج کل سیاست کے ساتھ "مسلم انڈیا" کے نام سے ایک ماہوار انگریزی رسالہ بھی نکالتے ہیں جس میں ان کا اداریہ خاص طور پر قابلِ مطالعہ ہوتا ہے۔ ان سے ہندوستانی مسلمانوں کے مستقبل پر بڑی فکر انگیز بحث رہی۔ سیّد صاحب کا کہنا ہے کہ ہندوستانی مسلمان اسی وقت یہاں کوئی مؤثر کردار ادا کر سکتے ہیں جب وہ پاکستان کی طرف دیکھنا چھوڑ دیں گے ان کا نقطۂ نظریہ ہے کہ مسلمان اپنی جُداگانہ سیاسی تنظیمیں بنانے کے بجائے ملک گیر سیاسی جماعتوں میں شامل ہو کر ملک کی خدمت کریں میں نے پاکستان کے حالات سے انہیں بہت باخبر پایا اور ان سے مل کر انہیں دوبارہ ملنے کی خواہش پیدا ہوئی۔

کافی کا ایک کپ جناب آئی کے گجرال کے ساتھ بھی پیا وہ اس لحاظ سے میرے ہم عصر ہیں کہ ہم دونوں ایک ہی زمانے میں اپنے اپنے ملک میں وزیر اطلاعات تھے۔ پیچھے پاکستان تشریف لائے تو میرا پتہ بھی کرایا مگر میں ملک سے باہر تھا۔ جہلم کے رہنے والے ہیں لاہور میں تعلیم حاصل کی۔ اپنے زمانۂ طالب علمی میں پنجاب اسٹوڈنٹس فیڈریشن کے صدر بھی رہ چکے ہیں۔ بڑی بے تکلفی سے ملے جیسے کسی دیرینہ آشنا سے ملے ہوں پاکستان کے بارے میں ان کا رویہ ہمدردانہ بلکہ دوستانہ ہے۔ آج کل اندرا گاندھی کے مخالف سیاسی محاذ کے سربرآوردہ رکن ہیں، کسی سیاسی جماعت میں شامل ہوئے بغیر آزادانہ سیاست کر رہے ہیں۔

دو تقریبات میں شامل نہ ہو سکنے کا افسوس رہے گا، دہلی کے مشہور صحافی جناب راجندر سرین نے (جنھوں نے حال ہی میں پاک بھارت تعلقات پر ایک کتاب بھی لکھی ہے) ساؤتھ ایسٹ ایشیا فورم میں مجھے بطور مہمانِ خصوصی مدعو کیا، کارڈ بھی شائع ہو گئے تھے اور دہلی کے ممتاز سیاستدانوں اور دانشوروں کی طرف سے اجلاس میں شرکت کی دعوت بھی قبول کر لی گئی تھی کہ مجھے اچانک اپنا دورہ مختصر کر کے واپس آنا پڑا۔ دوسری تقریب جامعۂ ملیہ دہلی نے منعقد کی تھی میں خود اس مایۂ ناز یونیورسٹی میں حاضری دینے کا خواہشمند تھا گو کہ دعوت اس کے وائس چانسلر کی طرف سے ہو اور لنچ کا بھی انتظام ہو اور میں نہ جا سکوں مگر بات ہی کچھ ایسی تھی ایک تو اس دن دلّی میں میرا آخری دن تھا دوسرے تیز بخار آ گیا تھا اور تیسرے دہلی کے بازار میں دوست احباب کے لئے کچھ تحفے تحائف بھی خریدنے تھے۔ لاچار اپنے نہ آ سکنے کی اطلاع کر دی اور اس کا قلق ہے کہ وہ بھی عین تقریب سے دو گھنٹے قبل، اس کے لئے یونیورسٹی کے اربابِ حل وعقد کو زحمت ہوئی ہوگی اس کیلئے صدق دل سے عفو خواہ ہوں مگر خیر یار زندہ صحبت باقی

زندگی ہے تو فقیروں کے بھی پھیرے ہوں گے

بھارت کا جمہوری نظام

دنیا میں بھارت کو جو امتیازی مقام حاصل ہے اس کا بنیادی سبب اس کا جمہوری نظام ہے' اسے دنیا کا سب سے بڑا جمہوری ملک کہا جاتا ہے اور اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اپنی بعض کوتاہیوں اور کمیوں کے باوجود آزادی کے بعد سے یہاں جمہوری عمل پوری طرح جاری و ساری ہے' سب سے بڑی بات یہ ہے کہ بھارتی عوام کو اپنے ووٹ کی طاقت پر اعتماد اور اعتبار ہے انہیں یقین ہے کہ وہ جب چاہیں گے الیکشن کے ذریعے اپنی من پسند حکومت کو بر سر اقتدار لے آئیں گے' اندرا گاندھی ہمیشہ سے ان کے دلوں پر راج کرتی رہی ہیں لیکن جب ہنگامی حالات نافذ کر کے انہوں نے من مانی کارروائیاں شروع کر دیں اور ایک ڈکٹیٹر کا رُوپ دھار لیا تو وہ قبولِ عامہ کے سنگھاسن سے اُتار دی گئیں اور انتخابات میں بُری طرح شکست کھا گئیں۔ کئی سال تک مشکلیں سہنے' مقدمے بھگتانے اور تکلیفیں اٹھانے کے بعد جب بھارت کے لوگوں کو یقین آ گیا کہ اب انہیں کافی سبق مل چکا ہے وہ انہیں دوبارہ بر سرِ اقتدار لے آئے۔

اس جمہوری نظام کا ایک نتیجہ یہ بھی ہے کہ یہاں احتسابِ عامہ کی حِس کافی بیدار ہے مہاراشٹر کے وزیر اعلیٰ عبدالرحمٰن ان تلے کا قصہ کچھ زیادہ پرانا نہیں ہوا' انہوں نے ایک ٹرسٹ قائم کیا اور اپنی سرکاری پوزیشن سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اس کے لئے صنعتکاروں اور سرمایہ داروں سے گراں قدر عطیات جمع کرنے شروع کئے۔ یہ کوئی نہیں کہہ سکتا تھا کہ یہ عطیات وہ اپنی ذات کے لئے جمع کر رہے ہیں۔ اس فنڈ سے وہ سکولوں' آشرموں' یتیموں' بیواؤں کی امداد کرتے تھے ان کا حوصلہ یہاں تک بڑھا ہوا تھا کہ نقدی

نہیں چیک بھی لینے لگے۔ حالانکہ اس طرح ان کی طرف سے فنڈ وصول کرنے کا کھلم کھلا ثبوت فراہم ہو سکتا تھا مگر وہ مقبول رہے تھے اور اندرا گاندھی کے قرب کی وجہ سے انہیں اس کی کچھ پرواہ نہ تھی' ان کے بیٹے کی شادی ہوئی تو تقریباً ساٹھ ہزار افراد نے اس میں شرکت کی یہ ان کی مقبولیت اور عوامیت کی ناقابل تردید شہادت تھی مگر جب بات حد سے بڑھ گئی تو اپوزیشن نے فنڈز کے مسئلے کو اسمبلی میں اٹھایا' پریس نے ثبوت شائع کئے' عوام نے احتجاج کیا اور اندرا گاندھی کو اپنے اس چہیتے وزیر اعلیٰ کی برطرفی کا داغ سہے بغیر کوئی چارۂ کار نہ رہا' اب دو ڈھائی سال سے ان پر اختیارات کے ناجائز استعمال کا مقدمہ چل رہا ہے۔ جو اس وقت سپریم کورٹ میں زیرِ سماعت ہے اور "ان تلے" صاحب کا نام سیاستدانوں کی غلط کاریوں کے لئے ضرب المثل بنا ہوا ہے یہاں تک کہ فلموں کے ڈائیلاگ میں بھی اس سلسلے میں خفی اور جلی اشارے کئے جا رہے ہیں۔ ابھی بھارت میں سیاستدانوں کے طور اطوار بے نقاب کرنے کے لئے فلم سازی کا ایک سلسلہ شروع ہوا ہے اور اب تک اس طرح کی کوئی تین چار فلمیں منظرِ عام پر آ چکی ہیں' "یہ دیش" نامی فلم میں ایک بار برشدہ شدہ وزیر اعلیٰ بن جاتا ہے اور بے دریغ فنڈ اکٹھا کرنا شروع کر دیتا ہے' سیمنٹ کے بیوپاری اسے سونے میں تول کر سونا اس کے حوالے کرنے لگتے ہیں تو وہ کہتا ہے۔

"ہاں میں تُلے اَن تُلے ہر طرح سرمایہ جمع کرنا چاہتا ہوں"

اے آر ان تلے صاحب کے اس واقعہ کے پس منظر میں ڈائیلاگ کے یہ بول بھارتی عوام میں جس قدر مقبول ہوئے ہوں گے اس کا اندازہ آسانی سے لگایا جا سکتا ہے۔ جن دنوں میں بھارت میں تھا اس سے ملتا جلتا ایک واقعہ اور پیش آیا' مہاراشٹر ہی کے ڈپٹی چیف منسٹر رام راؤ ادک غیر ملکی دورے پر تشریف لے گئے' انڈین ایئر لائنز کے طیارے میں سوار ہوتے ہی شراب کا آرڈر کیا اور اتنی پی کہ دُھت ہو گئے اسی نشے کی حالت میں ایئر ہوسٹسوں پر دست درازی شروع کر دی ابھی وہ جرمنی پہنچے ہی تھے کہ یہ خبر بھارتی پریس میں شائع ہو گئی' صوبائی اسمبلی میں اپوزیشن نے گرما گرم تقریریں کیں اور مسٹر ادک کے استعفیٰ کے مطالبے کئے' پریس نے بھی واقعہ کا کڑا نوٹس لیا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ مسٹر ادک واپس پہنچے تو ان کے پاؤں کے نیچے سے زمین نکل چکی تھی وہ کانگریس کے ممتاز لیڈر تھے۔ دہلی پہنچے تاکہ ہائی کمان سے مدد حاصل کریں۔ یہاں ٹُھسّے سے ایک بیان بھی جاری کیا جس میں واقعہ کی تردید اور استعفیٰ نہ دینے کے عزم کا اعلان تھا مگر بمبئی پہنچے تو سیاسی پریشر اتنا بڑھ چکا تھا اور عوام اس واقعہ پر اتنے مشتعل تھے کہ وزیر اعلیٰ کو ان سے استعفیٰ طلب کرتے ہی بنی اب ادک صاحب ہیں کہ

پھرتے ہیں میرؔ خوار کوئی پوچھتا نہیں

کی زندہ مثال بنے جوتیاں پٹخاتے پھر رہے ہیں

میں نے بھارت میں اپنے دو ہفتے کے قیام کے دوران اخبار نویسوں' سیاستدانوں اور عوام کے مختلف طبقات کے نمائندوں سے ملنے کے بعد جو اندازہ لگایا تھا وہ یہ تھا کہ بھارت اِن ہونے والے انتخابات

کے بعد مخلوط حکومت کے دَور میں داخل ہوجائے گا۔ اندرا گاندھی واحد اکثریتی پارٹی کی حیثیت سے کامیاب تو ہوجائیں گی لیکن تنہا حکومت بنانے میں کامیاب نہ ہوسکیں گی اس کے لئے انہیں کسی دوسرے گروپ کو بھی ساتھ ملانا پڑے گا لیکن سکھوں کے خلاف کارروائی کرنے کی وجہ سے انہیں ہندو عوام میں جو مقبولیت حاصل ہوئی ہے اس کی وجہ سے شاید اب صورتحال بدل جائے اور وہ بدستور سیاہ و سفید کی مالک بن کر دوبارہ مطلعٔ سیاست پر نمودار ہوں لیکن ایک بات بہرحال طے ہے کہ کم سے کم ان کے بعد تو بھارت "ون پارٹی رُول" کے دَور سے نکل ہی آئے گا مسز گاندھی کے بعد کوئی ایسی قد آور شخصیت موجود نہیں جو الیکشن میں اپنی پارٹی کو ایسی بھرپور کامیابی سے ہمکنار کر سکے، خود کانگریس ان کے بعد اپنی کشش کھو دے گی جس کی وجہ سے اب تک وہ بھارتی عوام کے لئے مرکزِ توجہ بنی ہوئی ہے۔ راجیو گاندھی کو آگے بڑھانے کی کوششیں ہورہی ہیں اور مجھے یہ کہنے میں کوئی باک نہیں کہ کم سے کم کانگریس کے اندر انہیں اوپر لانے کی یہ کوششیں سیاسی عمل کا ایک حصہ ہیں۔ مسٹر راجیو کو کسی سطح پر نامزد نہیں کیا جارہا وہ پارٹی الیکشن کے ذریعے آگے بڑھ رہے ہیں اور اگر ان کی پارٹی انہیں اپنا قائد بنانا چاہتی ہے تو اس پر اعتراض کی گنجائش باقی نہیں رہ جاتی لیکن آگے چل کر مسز اندرا گاندھی کے بعد اگر مسٹر راجیو وزیراعظم بن بھی گئے تو وہ ایک مخلوط حکومت کے وزیراعظم ہوں گے اور یہ بات بجائے خود بھارتی جمہوریت کے لئے نیک فال ثابت ہوگی۔ یک جماعتی حکومت کا تجربہ بھارت نے بہت کر لیا ہے اس سے جہاں اسے استحکام ملا وہاں اسے حکمرانوں کی روش سے کچھ شکایات بھی پیدا ہوئیں۔ کم سے کم مخلوط حکومت میں کسی آمرانہ طرزِ عمل کا تو خطرہ باقی نہیں رہے گا۔

بھارتی جمہوریت کے اس تجربے کی کامیابی کے جہاں اور بھی بہت سے اسباب ہیں (اور یہی ایک سبب کیا کم ہے کہ اس کے رہنماؤں کی اکثریت عوام کی صفوں سے اُٹھ کر آگے بڑھی تھی وہ فیوڈل کلاس کے نمائندے نہیں تھے اس لئے انہوں نے بیوروکریسی یا فوج کے ساتھ گٹھ جوڑ کر کے حکومت نہیں کی بلکہ عام انتخابات کا طریقہ رائج کر کے عوام کو سیاسی تربیت دی) وہاں ایک سبب سیاست میں فوج کی عدم مداخلت بھی ہے ایک تو بھارتی فوج کا مزاج ایسا ہے کہ اسے سیاست کی چاٹ نہیں پڑی۔ دوسرے سیاستدانوں نے اسے سیاست میں گھسیٹنے سے ہمیشہ اجتناب کیا ہے۔ تیسرے بھارت اتنا بڑا ملک ہے کہ وہاں فوجی حکومت کامیاب بھی نہیں ہوسکتی۔ اتنے بڑے ملک کو (جس کا ایک صوبہ اترپردیش پورے پاکستان کی آبادی سے زیادہ آبادی رکھتا ہے) فوج تادیر اپنی سنگینوں کے سائے میں متحد نہیں رکھ سکتی۔ فوجی حکومت قائم ہوئی تو بھارت دیکھتے ہی دیکھتے کئی چھوٹے ملکوں میں تقسیم ہوجائے گا۔ اس لئے میرے تجزیے کے مطابق بھارت کو "اندرا گاندھی کے بعد کیا ہو گا" کا کوئی سوال درپیش نہیں۔ بعض علاقوں میں پائی جانے والی علیحدگی پسندی مستقبل میں کوئی گل کھلا دے تو یہ الگ بات ہے لیکن اس کی ذمہ داری بھارتی جمہوریت پر عائد نہیں ہوگی۔ اس کی وجہ بھارتی آبادی اور علاقے کا پھیلاؤ اور بین الاقوامی سیاست

کے سمندر میں اُبھرنے والا جوار بھاٹا ہو گا۔ بہرحال ہماری خواہش اور کوشش یہی ہونی چاہئے کہ بھارت متحد رہے خدانخواستہ اس کے حصے بخرے ہوئے تو اس کے اثرات سے پاکستان بھی محفوظ نہیں رہے گا۔

....

بھارتی معاشرے کا ایک افسوسناک پہلو اس میں ہونے والے ہندو مسلم فسادات ہیں۔ آزادی کے بعد سے لے کر اب تک اس طرح کے سینکڑوں فسادات ہو چکے ہیں قدرتاً ان پر پاکستان میں تشویش کا اظہار کیا جاتا ہے اور بھارتی مسلمانوں کے ساتھ ہمدردی ظاہر کی جاتی ہے یہاں تک تو صحیح ہے لیکن اس سے آگے بڑھ کر جب ہمارے ہاں اس کی تمامتر ذمہ داری بھارتی حکومت اور بالخصوص اندرا گاندھی پر ڈال دی جاتی ہے وہاں سے بات حقیقت پسندی کی بجائے جذباتیت کے دائرے میں شامل ہو جاتی ہے۔ ایک بالکل پیش پا اُفتادہ اور صاف سیدھی کھری اور سچی حقیقت یہ ہے کہ کوئی بھی حکومت خواہ کتنی ہی گئی گزری اور خرابیوں کی پوٹ کیوں نہ ہو اپنے ملک میں خود فسادات نہیں کرا سکتی اس کے لئے اندرون ملک اسے لا اینڈ آرڈر کے جس پرابلم سے دوچار ہونا پڑتا ہے وہ تو ہے ہی بیرون ملک اس کی جو رسوائی اور بدنامی ہوتی ہے اس کا ڈر اور خوف بھی کچھ کم نہیں ہوتا' دوسرے ہندو مسلم فسادات کی تہہ میں چھُپے ہوئے ان تاریخی عوامل کو بھی ہمیں نظرانداز نہیں کرنا چاہئے جو صدیوں سے قائم اس خلیج کے پسِ پردہ کارفرما ہیں۔ تیسرے ہمیں یہ بھی نہیں بھولنا چاہئے کہ بھارت ایک وسیع و عریض سمندر ہے اس میں تعصبات کے مختلف جزیرے بنے ہوئے ہیں۔ بعض متعصب ہندو جماعتیں بھی قائم ہیں جن کی خواہش ہے کہ اقتدار کانگریس سے چھن کر ان کے ہاتھ میں چلا جائے۔ وہ فسادات کے ذریعے مسلمانوں کو کانگریس کی ہمنوائی کی سزا بھی دیتی ہیں اور اندرا گاندھی کے ہاتھ کمزور کرنے کی بھی کوشش کرتی ہیں۔ پھر بعض فسادات کے پیچھے اقتصادی وجوہ بھی کارفرما ہوتی ہیں۔ کسی جگہ مسلمان کاروباری اور اقتصادی حیثیت سے مضبوط ہوتے ہیں تو ہندوؤں کی طرف سے مسابقت کا جذبہ کہیں کہیں بھیانک شکل بھی اختیار کر لیتا ہے۔ مثال کے طور پر بھیونڈی (بمبئی) کے فسادات ہی کو لے لیجئے اس کے اسباب اقتصادی بھی تھے اور سیاسی اور مذہبی بھی۔ اقتصادی اس طرح کہ اس علاقے میں مختلف صنعتوں میں مسلم لیبر کی کثرت ہے۔ یہاں کی متعصب تنظیم "شیو سینا" کا مطالبہ ہے کہ کام صرف مہاراشٹر کے رہنے والے ہندوؤں کو ملنا چاہئے۔ ساؤتھ انڈین اور مسلمانوں کا اس پر کوئی حق نہیں۔ یہ علاقائی اور صوبائی تعصب کبھی کبھی خوفناک شکل بھی اختیار کر لیتا ہے۔ سیاسی محرک یہ تھا کہ بھیونڈی کی واحد اسمبلی سیٹ پر کانگریس کی طرف سے مسلمان نمائندہ کامیاب ہوا ہے۔ یہاں کی مسلم آبادی کانگریس کا ساتھ دیتی ہے۔ "شیو سینا" مسلمانوں کو اس کی بھی سزا دینا چاہتی تھی۔ مذہبی طور پر بھی یہ تنظیم سخت متعصب ہے اسے 1966ء میں بال ٹھاکرے نامی ایک کارٹونسٹ نے قائم کیا تھا جو مختلف اخبارات کے لئے کارٹون بنایا کرتا تھا۔ تنظیم کا نام "شیواجی" کے نام پر رکھا گیا جو آج سے تین سو سال پہلے مغلوں کے خلاف اس علاقے کا لیڈر بن کر لڑتا رہا ہے۔ شیواجی کا

یوم پیدائش منانے کے لئے ایک جلوس نکالا گیا جس کے دوران ٹھاکرے نے اسلام اور پیغمبرِ اسلام کے خلاف ہرزہ سرائی کی، مسلمانوں کو ترکِ وطن کر کے پاکستان چلے جانے کا حکم سنایا۔ ردِّ عمل کے طور پر مسلمانوں نے بھی ترکی بہ ترکی جواب دیا۔ اسمبلی کے مسلم ممبر نے ٹھاکرے کی ایک تصویر کو جوتوں کا ہار پہنایا۔ ان واقعات کے نتیجے میں فسادات پھیل گئے، مسلمانوں کے گھروں کو آگ لگائی گئی انہیں قتل و غارت کا نشانہ بنایا گیا۔ انتظامیہ میں بھی ہر قسم کے لوگ ہوتے ہیں یہاں کی پولیس میں بھی متعصب عناصر ہوں گے اس نے بھی مسلمانوں کو بچانے کے بجائے اُلٹا انہیں ہی تشدّد کا نشانہ بنایا۔ اس سارے سلسلۂ واقعات میں اندرا گاندھی غریب کہیں بھی نہیں آتی لیکن ہمارے ہاں ان فسادات پر جو اظہارِ خیال ہوا ہے اس میں ساری تان اسی کی مذمت کرنے پر ٹوٹی ہے حالانکہ کانگریس سیکولر طرزِ حکومت کی داعی ہے اس لئے وہ مذہبی امتیازات سے بالاتر ہو کر اپنے ووٹروں سے معاملہ کرتی ہے اس میں تاریخی جبریت کے علاوہ اس کے راستے میں کچھ دوسری رکاوٹیں بھی ہیں لیکن پھر بھی جس طرح کی بُری بھلی سیاست پر اندرونِ ملک وہ کاربند ہے وہ مسلمانوں کے لئے بساغنیمت ہے خیر کا پہلو اسی میں ہے کہ وہ بھارت میں سیکولر سیاست اور طرزِ حکومت کو کامیاب اور مضبوط بنانے کی کوشش کریں۔ پاکستان کے مسلمانوں کی بھی یہی کوشش ہونی چاہئے وہ دن بھارت کی تاریخ میں مسلمانوں کے لئے تاریک ترین دن ہو گا جب یہاں کوئی متعصب مذہبی جماعت برسرِ اقتدار آ گئی۔

سکھ ریاست کا خواب

میں دہلی میں تھا تو بھارتی پنجاب میں لاقانونیت کا دور دورہ تھا بعد میں یہ چند ہی دنوں کے اندر اندر شعلوں کی لپیٹ میں آ گیا ان واقعات پر غور کرنے سے پہلے ایک نظر سکھ سیاست کے اتار چڑھاؤ پر ڈال لی جائے تو بات سمجھنے میں آسانی ہوگی۔

ہمارے ہاں اکالی پارٹی اور سکھوں کو عام طور پر ایک دوسرے کا مترادف سمجھا جاتا ہے۔ خیال ہے کہ شاید ہر سکھ اکالی ہوگا اور اکالی پارٹی بھی خالصتان کی حامی ہوگی ایسا نہیں ہے سکھ جو پوری بھارتی آبادی کا دو فیصد ہیں چار حصوں میں تقسیم ہیں جاٹ، کھتری، مذہبی سکھ، دستکار۔ یہ تقسیم اتنی سخت ہے کہ یہ چاروں اصولی طور پر آپس میں شادیاں نہیں کرتے۔ جاٹ سکھ جاٹ سکھ ہی کو بیٹی دے گا اور کھتری کھتری کو، اگرچہ کھتری سکھ، کھتری ہندوؤں کے ساتھ رشتہ ناطہ کرنے میں کوئی حرج نہیں سمجھتے۔ سیاسی طور پر تقسیم یوں ہے کہ جاٹ عام طور پر اکالی پارٹی کے ساتھ ہیں، کھتری اور دستکار کانگریس کے حمایتی ہیں اور مذہبی سکھوں کی اکثریت بائیں بازو کی ہم نوا ہے۔ مذہبی سکھ، سکھوں میں وہی حیثیت رکھتے ہیں جو ہندوؤں میں شیڈول کاسٹ کی ہے گو سکھ چھوت چھات پر یقین نہیں رکھتے مگر پھر بھی مذہبی سکھ اقتصادی اور معاشی طور پر دوسرے طبقات کی نسبت پسماندہ ہیں اور سماجی طور پر جاٹوں کے زیر اثر ہیں (اگرچہ اپنے احساسِ محرومی کی وجہ سے وہ سیاسی طور پر بائیں بازو کی جماعتوں کا ساتھ دیتے ہیں) اکالی پارٹی بنیادی طور پر سیاسی جماعت ہے لیکن تھوڑا بہت مذہبی رنگ بھی رکھتی ہے اس میں شہروں کے رہنے والے اعتدال پسند سکھ

بھی شامل ہیں اور "جتھے دار" بھی۔ جتھے دار گوردواروں کی انتظامیہ سے بھی منسلک ہیں اور اس طرح ان کی وجہ سے اکالی پارٹی کو گوردواروں کا پلیٹ فارم بھی میسّر آجاتا ہے۔

اکالی پارٹی پنجابی زبان بولنے والوں کا صوبہ بنانے کی علمبردار رہی ہے بعض چھوٹے موٹے مذہبی

مطالبات بھی اس کی طرف سے اٹھائے جاتے رہے ہیں جن میں سے بعض پورے ہو چکے ہیں۔ پنجابی صوبہ بھی بن گیا لیکن اس سلسلے میں کچھ ضمنی اور ذیلی مسائل ابھی تک حل طلب چلے آرہے ہیں ان میں پانی کی تقسیم اور سرحدی علاقوں کے تصفیے کا مسئلہ تو ثالثوں کے سپرد ہے چندی گڑھ کو ہریانہ میں شامل کیا جائے یا پنجاب میں اس کا فیصلہ ہونا ابھی تک باقی ہے۔ کانگریسی حکومت اس سلسلے میں کچھ تو واقعی مجبوریاں رکھتی ہوگی کچھ وہ تعویق و تاخیر سے اکالی پارٹی کو نقصان بھی پہنچانا چاہتی تھی جو سالوں سے پنجاب میں اس کا مدِّمقابل بنی ہوئی ہے یہاں تک کہ 1967ء کے الیکشن میں اس نے جن سنگھ کے ساتھ مل کر کانگریس کے خلاف محاذ بنانے سے بھی دریغ نہیں کیا جو پنجابی زبان کی سخت مخالف اور ہندی زبان کے فروغ کامل کی علمبردار تھی کانگریس نے اکالی دل میں پھوٹ ڈلوا کر اس کے باغی رہنماؤں کے ساتھ کئی دفعہ مخلوط حکومت بھی قائم کی "ایمرجنسی" کے زمانے میں یہ تصادم اور بڑھ گیا ہزاروں سکھوں نے اکالی پارٹی کی اپیل پر گرفتاریاں پیش کیں اور اس طرح کانگریس اور اکالی پارٹی میں خلیج وسیع سے وسیع تر ہوتی چلی گئی۔ جنتا دل پارٹی کے دَورِ حکومت میں اکالیوں نے جنتا کے ساتھ مل کر پنجاب میں مخلوط حکومت قائم کی پنجاب کے سابق کانگریسی وزیر اعلیٰ گیانی ذیل سنگھ اور ان کے ساتھیوں کے خلاف انتقامی کارروائیاں ہونے لگیں کہا جاتا ہے کہ کانگریسی سکھ لیڈروں نے جوابی کارروائی کے طور پر مذہبی انتہاپسندوں کو اُکسایا اور جرنیل سنگھ بھنڈرانوالہ کی شخصیت حقیقت میں انہی کی کوششوں کے نتیجے میں مشہور و معروف ہوئی اس سلسلے میں گیانی ذیل سنگھ اور اندرا گاندھی کے پیدائشی سیاستدان بیٹے سنجے گاندھی کی کوششوں کا خاص طور پر ذکر کیا جاتا ہے۔

اندرا گاندھی دوبارہ برسرِ اقتدار آئیں تو پنجاب میں اکالی پھر اقتدار سے محروم ہو گئے۔ اکالیوں کی ان پے در پے ناکامیوں کی وجہ سے مذہبی انتہاپسندوں کو کھل کھیلنے کا موقع ملا۔ اکالیوں نے قیادت اپنے ہاتھ سے جاتے دیکھ کر جدّوجہد کو تیز تر کر دینے کا فیصلہ کیا آنندپور کے پرانے ریزولیوشن کی گرد جھاڑ کر اسے پھر سے تازہ کیا گیا اور از سرِنو چھتیس مطالبات پیش کر کے اس جدّوجہد کو "دھرم یُدھ" (مذہب کی جنگ) قرار دینے کا اعلان کر دیا گیا۔ سنت لونگووال کی زیرِ قیادت چند ماہ کے اندر اندر تقریباً اسّی ہزار اکالیوں نے گرفتاریاں پیش کیں۔ ادھر کانگریسی حکومت نے مذاکرات کے بغیر کچھ مطالبے تسلیم کر لئے اور تھوڑے ہی دنوں میں سکھ قیدیوں کو رہا کر دیا۔ ظاہر ہے یہ ساری کوششیں اکالی دل کو ناکام بنانے کے لئے ہو رہی تھیں اور یہ رنگ لائیں۔ سکھوں کی سیاسی قیادت بھی آہستہ آہستہ جرنیل سنگھ بھنڈرانوالہ جیسے

مذہبی تشدّد پسندوں کے ہاتھ میں چلی گئی۔ جرنیل سنگھ اور اس کے ہم نواؤں نے صوبائی خود مختاری کے نعرے کو چھوڑ کر سکھوں کی آزاد ریاست "خالصتان" کا نعرہ لگانا شروع کر دیا اور پنجاب بھر میں تشدّد اور دہشت گردی کی ایک لہر دوڑا دی۔ ہندو رہنماؤں کو چُن چُن کر موت کے گھاٹ اتارا جانے لگا نمایاں کانگریسی سکھوں کو بھی نہیں بخشا گیا ان میں سے بھی بہت سے قتل کر دیئے گئے۔ ایک محتاط اندازے کے مطابق "دربار صاحب ایکشن" سے پہلے مذہبی تشدّد پسندوں کے ہاتھوں تقریباً تین سو افراد جان سے ہاتھ دھو بیٹھے۔ دربار صاحب امرتسر کو جرنیل سنگھ نے اپنی تمام کارروائیوں کا ہیڈ کوارٹر بنا لیا یہاں بے شمار اسلحہ اکٹھا کر کے رضا کاروں کو کیل کانٹے سے لیس کر دیا گیا اور جرنیل سنگھ دربار صاحب میں بیٹھ کر عملاً پنجاب پر حکومت کرنے لگا۔ قانون معطل ہو کر رہ گیا' انتظامیہ مفلوج ہو گئی' ہندو آبادی ڈر کے مارے پنجاب سے نقل مکانی کرنے لگ پڑی۔ یہ تھے وہ حالات جن میں مرکزی حکومت کے اشارے پر فوج حرکت میں آئی اور اس نے دربار صاحب کا محاصرہ کر کے سینکڑوں سکھوں کو گولیوں کا نشانہ بنا کر اور سینکڑوں کو زندہ گرفتار کر کے ایک مرتبہ پھر حالات پر اپنی آہنی گرفت کا لوہا منوالیا۔

دربار صاحب میں جو واقعات پیش آئے' خون کی جو ہولی کھیلی گئی' ایک مقدس مقام کی جو بے حرمتی ہوئی وہ اپنی جگہ قابلِ صد افسوس ہے اور ہمیں فی الواقع اس کے لئے سکھوں سے پوری پوری ہمدردی ہے لیکن سوال یہ ہے کہ اس کی ذمہ داری کس پر عائد ہوتی ہے؟ کون سی حکومت ہے جو اپنے ملک میں ایک متشدّدانہ علیحدگی پسند تحریک کو تا دیر برداشت کر سکتی ہے؟ اندرا گاندھی کی حکومت نے تو پھر بہت صبر سے (بلکہ ضرورت سے زیادہ نرمی اور کسی حد تک غفلت سے) تین سو شہریوں کا قتل برداشت کیا کوئی اور حکومت ہوتی وہ اتنی چھوٹ بھی نہ دیتی اور پہلے ہی مرحلہ میں تشدّد پسندوں کا قلع قمع کر کے دم لیتی۔ سکھ تحریک کی اوّل و آخر کمزوری یہی ہے کہ انہوں نے اپنی کامیابی کے لئے تشدّد اور تخریب کاری کا راستہ اختیار کیا۔ اگر انہیں کامیاب ہونے دیا جاتا تو اس کا مطلب یہ تھا کہ بھارت میں صرف پنجاب ہی کی آزاد ریاست قائم نہ ہوتی کئی دوسرے صوبوں میں بھی علیحدگی کی تحریکوں کا راستہ روکنا ناممکن ہو جاتا۔ ہمیں تسلیم ہے کہ دربار صاحب کی بے حرمتی نہیں ہونی چاہئے تھی مگر فوج کو اس کا موقع کس نے فراہم کیا؟۔ دربار صاحب عبادت کے لئے تھا اسلحہ خانہ تو نہ تھا' یہ سکون حاصل کرنے کے لئے تھا بے سکونی پھیلانے کے لئے تو نہ تھا' گوردوارہ تھا قلعہ تو نہ تھا جس میں مورچہ بند ہو کر مخالفین کی جان لینے کے منصوبے بنائے جائیں۔ اگر سکھوں کو دربار صاحب کی بے حرمتی کا خیال تھا تو انہیں فوج کے آتے ہی اپنے آپ کو گرفتاری کے لئے پیش کر دینا چاہئے تھا۔ فوج پر گولیوں کی بوچھاڑ کر کے یہ توقع رکھنا کہ جواب میں پھول برسائے جائیں گے کہاں کی دانشمندی تھی؟ خانہ کعبہ ہم مسلمانوں کا قبلہ ہے روئے زمین پر خدا کا پہلا گھر ہے اس کا ذرّہ ذرّہ ہمارے لئے آفتاب و ماہتاب سے بڑھ کر ہے لیکن آج سے تین چار سال پہلے ایک

گروہ نے اس میں بدامنی پھیلادی تھی اور خانہ کعبہ میں اپنے آپ کو محصور کر کے اپنے تئیں محفوظ بنالیا تھا مگر اس کے تہہ خانوں میں تو باغیوں کی لاشیں پڑی ملیں ' کیا خانہ کعبہ کی اس بے حرمتی کی ذمہ دار سعودی حکومت تھی یا وہ باغی جنہوں نے اپنے مذموم مقاصد کے لئے خانہ کعبہ کو استعمال کرنا چاہا تھا؟ ہمارا خیال ہے کہ جب بھی جذبات کا خروش کم ہو گا اور اُبلے ہوئے احساسات ٹھنڈے ہو جائیں گے ' ہوشمند سکھ بھی اس سانحہ کی تمام تر ذمہ داری اپنی اس جوشیلی اور جذباتی قیادت پر عائد کریں گے جس نے اپنی بے تدبیری سے حالات کو اس موڑ پر پہنچا دیا ' سچ ہے تجربے اور عمر سے بھی انسان بہت کچھ سیکھتا ہے ' ایک کردار لونگووال کا ہے جس نے اپنے آپ کو فوج کے سامنے گرفتاری کے لئے پیش کر دیا۔ ایک جرنیل سنگھ کا جو آخری وقت تک گولی چلاتا رہا جیسے اپنے ملک کی فوج سے نہیں کسی دشمن فوج سے سامنا ہے ' یہ دونوں کردار دو ذہنی رویّوں کی نشاندہی کرتے ہیں ایک ہوش کا نمائندہ ہے دوسرا اندھے جوش کا۔ ایک حُبّ الوطنی پر مبنی ہے دوسرا بغاوت پر۔ ایک بڑھاپے کے سکھائے ہوئے اَن گنت تجربات کا مظہر ہے دوسرا 37 سالہ ناتجربہ کار الہڑ جوانی کا۔ جذبات کی رو تھمے گی تو ہمیں یقین ہے کہ ہر معقول سکھ ہوش اور حُبِّ وطن کے کردار کو سراہے گا اور اندھے جوش اور بغاوت کی روش کو رد کر دے گا۔

یہ سوال مستقبل سے تعلق رکھتا ہے کہ سکھوں کے خلاف بھارتی حکومت کے اس اقدام کے آگے چل کر کیا نتائج بر آمد ہوں گے؟ سطح بیں مبصرین کے نزدیک بھارتی وزیر اعظم نے اس طرح اپنے اور اپنے بیٹے راجیو کی زندگی کو خطرے میں ڈال دیا ہے ان کے نزدیک سکھ انتقام لئے بغیر نہیں رہیں گے اور انتقام کی بہترین صورت یہ ہے کہ وہ اندرا گاندھی یا اس کے بیٹے کی جان لے لیں مگر حالات کا یہ مطالعہ اور تخمینہ انتہائی بچگانہ اور بے حد سرسری ہے۔ ظاہر ہے کوئی بھی بڑا اقدام رسک لئے بغیر نہیں کیا جا سکتا۔ اندرا گاندھی نے یہ کارروائی کر کے بظاہر تو خطرات کو دعوت دی ہے لیکن جُوں جُوں وقت گزرتا چلا جائے گا ان کی پوزیشن مضبوط ہوتی جائے گی خود سکھ اس غیر دانشمندانہ قیادت کا محاسبہ کریں گے اور وقت کے ساتھ ساتھ جذبات کی آندھی اترتی چلی جائے گی۔ بیرون ملک رہنے والے سکھ آہستہ آہستہ حقیقت کو سمجھنے لگیں گے۔ مسز گاندھی کی دانشمندی ہے کہ انہوں نے دربار صاحب کی کارروائی بھی سکھ جرنیلوں کی زیرِ سرکردگی کرائی ہے اس سے یہ الزام بھی نہیں لگایا جا سکے گا کہ یہ کسی دوسرے مذہب کے ماننے والوں کی کارستانی ہے۔

ہم پاکستانیوں کو سکھوں کی مذہبی ریاست قائم کرنے کے مطالبے سے ہرگز کوئی ہمدردی نہیں ہونی چاہئے ' آج سکھ راج قائم ہوا تو کل ہندو مہا سبھا اور جن سنگھ کا "ہندو راج" بھی قائم ہو سکتا ہے اس صورت میں بھارت کے چودہ پندرہ کروڑ مسلمانوں کا جو حشر ہو گا اس کے تصور سے روح کانپ اٹھتی ہے۔ ہمیں تو بھارت میں سیکولر سیاست اور طرزِ حکومت کا مؤید ہونا چاہئے ' ہماری سرحدات پر سکھ

ریاست کل کلاں اِس حصۂ پنجاب کے ان علاقوں پر بھی حق جتا سکتی ہے جس میں اس کے مقدّس مقامات واقع ہیں۔ ہمیں بھارت کے ساتھ اپنی سرحدیں منظور ہیں لیکن خالصتان کے ساتھ نہیں۔ ہمیں خوشی ہے کہ اس سلسلے میں حکومت نے بڑی متوازن خارجہ پالیسی اپنا رکھی ہے وہ بعض اشتعال انگیز بیانات کے باوجود بھارت کے اندرونی معاملات میں عدم مداخلت کا رویّہ اپنائے ہوئے ہے خدا کرے کہ بھارتی اخبارات اور جنتا بھی ہوش کے ناخن لیں اور خواہ مخواہ اس سلسلے میں پاکستان پر الزام تراشی کر کے خوشگوار تعلقات کی فضا کو مکدّر بنانے کی کوشش نہ کریں۔

نگاہِ بازگشت

بھارت اتنا بڑا ملک ہے کہ اسے دیکھنے اور اس کے سیاسی' معاشی اور معاشرتی حالات کا جائزہ لینے کے لئے چند روزہ قیام کوئی حیثیت نہیں رکھتا لیکن پھر بھی اپنی "صحافیانہ دُور بینی" کے تحت میں نے جو کچھ دیکھا اور محسوس کیا وہ اتنا غیر اہم بھی نہیں کہ اہلِ وطن کے سامنے اسے پیش نہ کروں۔

سب سے پہلا تاثر جو بھارت جانے والے کسی بھی سیّاح کے دل و دماغ میں اُبھرتا ہے یہ ہے کہ بھارت ایک غریب ملک ہے۔ غربت پاکستان میں بھی ہے لیکن یہاں فاقہ زدگی کی وجہ سے شاید ہی کوئی شہری موت کا شکار ہوتا ہو مگر بھارت میں بھوک کی وجہ سے موت روز مرّہ کی بات ہے۔ جن لوگوں کو بمبئی جانے کا اتفاق ہوا ہے انہوں نے دیکھا ہو گا کہ یہاں ہزاروں نہیں لاکھوں شہری فٹ پاتھوں یا زیادہ سے زیادہ جھونپڑیوں میں زندگی کے دن گزارتے اور یہیں پر کیڑے مکوڑوں کی طرح رینگ رینگ کر ختم ہو جاتے ہیں۔ فٹ پاتھ ریستوران دنیا بھر میں شاید صرف اسی شہر کی ایجاد ہیں۔ کسی بھی سائے اور شیلٹر کے بغیر ایک دو دیگیں رکھ کر دکاندار فٹ پاتھ پر ہی اپنے گاہکوں کو کھانا کھلا دیتا ہے۔ فاقے سے بچنے کے لئے عصمت فروشی عام ہے۔ بمبئی میں یہ حیا سوز کاروبار جس بازار میں ہوتا ہے وہاں پانچ ہزار عورتیں یہ دھندا کرتی ہیں۔ شام کو آپ اس بازار سے گزریں تو ایسا لگے گا جیسے آپ مویشیوں کی منڈی میں پہنچ گئے ہیں۔ اپنی اپنی کھولیوں کے باہر بیس بیس پچیس پچیس عورتیں کھلم کھلا لوگوں کو دعوتِ گناہ دینے میں مشغول نظر آتی ہیں۔ بمبئی کے ادیب اور فنکار ان عورتوں کو معاشرتی اور معاشی جبر کا شکار ٹھہرا کر مظلوم و مجبور قرار

دیتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے یہ عورتیں جسم نہ بیچیں تو اپنے اور اپنے گھر والوں کا پیٹ کیسے پالیں۔ بنتِ حوّا کی یہ تذلیل بھارت کی فاقہ زدگی کا منہ بولتا اشتہار ہے۔

مگر عجیب تر بات یہ ہے کہ بھارت اپنی اس تمام تر غربت کے باوجود اپنے دیش کی "انا" سے سرشار ہے۔ آپ اس کے طول و عرض میں گھوم جائیں وہاں سوئی سے لے کر ہاتھی تک آپ کو ہندوستانی ہی دستیاب ہو گا۔ بمبئی اور دہلی جیسے بڑے شہروں میں جہاں سڑکوں پر گاڑیاں شمار قطار سے باہر ہیں آپ کو شاید ہی کوئی باہر کی گاڑی نظر آئے۔ بڑے بڑے سیٹھ اور افسر اور وزیر اپنے ہی ملک کی بنائی ہوئی گاڑیاں استعمال کرتے ہیں۔ دیسی مصنوعات کی اس سرپرستی کا نتیجہ یہ ہے کہ بھارتی معاشرہ میں سادگی عام ہے۔ سوسائٹی کے ان طبقات کی بات نہیں کرتا جہاں "عصمتِ بی بی ست از بے چادری" کی وجہ سے کسی سازوسامان کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ ان سر برآوردہ' ہائی کلاس امیر کبیر گھرانوں کی بات کر رہا ہوں جنہیں اللہ نے سب کچھ دے رکھا ہے۔ آپ ان کے ہاں چلے جائیں آپ کو کوئی کروفر' نمود و نمائش اور ٹھاٹھ باٹھ نظر نہیں آئے گا۔ یہی حال سرکاری دفتروں کا ہے ہمارے ہاں کی طرح ایسا نہیں کہ سرکاری گاڑیوں کے پرّے جمے ہوئے ہیں ہر وزارت کے پاس گاڑیوں کے بیڑوں کے بیڑے ہیں۔ ابھی اخبارات میں نظر سے گزرا کہ صوبہ سندھ کے وزیروں کے لئے لاکھوں روپے کے خرچ سے جونئی گاڑیاں در آمد ہوئی ہیں بعض وزراء صاحبان کو ان کا رنگ پسند نہیں آیا اور وہ انہیں بدلنے کے خواہشمند ہیں مگر یہاں

جو صورتحال ہے اس کا اندازہ ایک واقعہ سے لگایئے جو خود میرے ساتھ پیش آیا۔ مجھے بھارت کے وزیرِ خارجہ سے ملنے کے لئے جانا تھا ایک دوست مجھے یہاں پہنچا کر چلے گئے اور یہ کہہ کر گئے کہ وہ مقررہ وقت پر آ کر مجھے واپس لے جائیں گے۔ میں اتفاق سے قبل از وقت فارغ ہو گیا مسٹر لامبے کو فکر لاحق ہوئی کہ کوئی سرکاری گاڑی مجھے میرے ہوٹل پہنچا آئے اور وزارتِ خارجہ جیسی اہم ترین منسٹری میں کوئی فاضل گاڑی موجود نہ تھی جو مجھے پہنچا سکتی۔ آخر وزارت کے ایک ڈائریکٹر مسٹر ترپاٹھی خود اپنی گاڑی میں (اور ظاہر ہے خود ہی ڈرائیو کرتے ہوئے) مجھے ہوٹل تک پہنچانے آئے شاید پوری وزارت میں یہ امتیاز انہیں ہی حاصل تھا کہ وہ ایک ٹویوٹا گاڑی کے مالک ہیں۔ بھارت میں اپنے قیام کے دوران یہ پہلی ہی ٹویوٹا مجھے نظر پڑی تھی۔ بڑی حیرانی ہوئی 'پوچھنے پر معلوم ہوا کہ مسٹر ترپاٹھی ابھی حال ہی میں دلّی آئے تھے اس سے پہلے بیرون ملک ایک بھارتی سفارتخانے میں متعین تھے۔ یہ گاڑی وہ قواعد کے تحت در آمد کر کے لائے ہیں۔

مسلمان عوام سے گھُلنے ملنے اور براہِ راست ان کے حالات کا جائزہ لینے کے مواقع مجھے نہیں مل سکے۔ دیوبند اور علی گڑھ جانے کا ارادہ تھا لیکن دہلی کی مصروفیات نے ہی اتنا گھیراؤ کر لیا کہ باہر نکلنے کی نوبت ہی نہیں آئی۔ زندگی رہی تو سالِ آئندہ ان مقامات پر بھی ضرور جاؤں گا۔ پھر بھی مسلمان سیاستدانوں' دانشوروں' ممبران اسمبلی اور بعض علمائے کرام سے تبادلۂ خیال کے نتیجے میں مَیں نے جو رائے قائم کی وہ یہ

تھی کہ بھارتی مسلمان مشکل حالات میں بھی ہم پاکستانی مسلمانوں سے کہیں بہتر مسلمان ہیں۔ ان میں اپنے مذہب اور ثقافت سے جو تعلق اور لگاؤ ہے وہ ہم میں ناپید ہے۔ نامساعد حالات نے انہیں اپنے عقیدے اور اپنے رب سے زیادہ قریب کر دیا ہے۔ وہ ہم سے زیادہ صوم وصلوٰة کے پابند اور پیروِ شریعت ہیں۔

مسلمانوں کی سیاسی جماعتیں یوں تو کئی ہیں لیکن تین جماعتیں ان میں زیادہ اہم ہیں۔

1۔ جماعت اسلامی

2۔ جمعیت علمائے اسلام

3۔ مسلم لیگ

مجلسِ مشاورت تھی لیکن وہ کم وبیش مرحوم ہو چکی ہے ان میں جماعت اسلامی زیادہ منظم اور وسائل کی مالک ہے مگر یہ معروف معنوں میں سیاسی جماعت اس لئے نہیں کہلاتی کہ الیکشن میں حصہ لینا اس کے نزدیک مذہباً ناجائز ہے۔ وہ ایک سیکولر حکومت کی ملازمت کو بھی اسلام کے خلاف سمجھتی ہے۔ عزیمت کا جو راستہ اس جماعت نے اختیار کیا ہے اس پر چلنا عوام کالانعام کے بس کی بات نہیں پھر بھی چند ہزار مخلصین اپنی اپنی آبادیوں میں اسلام اور اسلامی تشخص کے لئے برابر سرگرمِ عمل رہتے ہیں۔ یوں تو بھارت کی جماعت اسلامی کا فکری سرمایہ اور اثاثہ بھی حضرت مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی مرحوم کا تخلیق کردہ لٹریچر ہے لیکن جماعت کی قیادت پر جو اصحاب فائز ہیں وہ دینی تعلیم سے مالامال ہیں اس لئے مولانا مودودی مرحوم کے پیدا کردہ دینی مزاج کے علاوہ اپنی بصیرت بھی رکھتے ہیں۔ مولانا سے بعض مسائل میں انہیں اختلاف بھی ہے۔ مختلف زبانوں میں جماعت کا لٹریچر اور اخبارات وجرائد بحیثیت مجموعی مسلمانوں میں مفید اثرات پیدا کر رہے ہیں جماعت کا پریس مسلمانوں کے مسائل ومطالبات کے سلسلے میں اکثر مؤثر آواز بلند کرتا رہتا ہے۔

دوسری جماعت، جمعیت علمائے اسلام ہے اسے مسلمانوں میں کانگریس کا مذہبی مورچہ سمجھا جاتا ہے۔ ایک زمانہ تھا کہ اس کی قیادت حضرت مولانا حسین احمد مدنی مرحوم جیسے جید علماء کے ہاتھ میں تھی اب اس عہدِ زوال میں وہ پہلی سی بات تو نہیں رہی لیکن پھر بھی مولانا مدنی کے صاحبزادے مولانا اسد مدنی جیسے جرأتمند بزرگ آج بھی اس کے لیڈر کی حیثیت سے بھارت کے طول وعرض میں ایک جانی پہچانی شخصیت کے مالک ہیں، ہرچند کہ دارالعلوم دیوبند کے جھگڑے میں مولانا اسد کا نام متنازعہ بن گیا ہے لیکن پارلیمنٹ کے ممبر کی حیثیت سے مسلمانانِ بھارت کے لئے ان کی خدمات سے انکار ممکن نہیں۔ جمعیت کے بعض دوسرے اراکین بھی پارلیمنٹ کے ممبر ہیں وہ بھی حتی المقدور اپنا فرض بجالانے کی کوشش کرتے رہتے ہیں لیکن مشکل یہ ہے کہ جمعیت اب تک اپنے آپ کو ایک منظم جماعت نہیں بنا سکی یہ عوام سے زیادہ خواص کی جماعت ہے اور خواص میں بھی صرف دیوبندی مکتبِ فکر کے ایک دھڑے کی تائید اسے حاصل ہے۔

تیسری قابلِ ذکر تنظیم مسلم لیگ ہے اس کے قائد سیٹھ ابراہیم سلیمان اپنے چند دوسرے ساتھیوں کے ساتھ پارلیمینٹ کے ممبر ہیں اور اس حیثیت میں گذشتہ دنوں میں پاکستان کا دورہ بھی کر چکے ہیں۔

سیٹھ صاحب ایک مخلص اور پُرجوش مسلمان ہیں اور بھارتی مسلمانوں کے دکھ درد میں ان کے کام آتے ہیں ہر چند کہ ان کی جماعت ملک گیر اثرات نہیں رکھتی مگر مسلمان اکثریت کی بعض آبادیوں میں اسے اچھا خاصا رسوخ حاصل ہے۔ مسلم لیگ مسلمانوں کے مختلف فرقوں کے درمیان اتحاد اور ہم آہنگی پیدا کرنے کے لئے برابر جدّوجہد کرتی رہتی ہے اور اس سلسلے میں خاص طور پر بنارس میں شیعہ سنّی نزاع کو روکنے کے لئے اس کی کوششیں خاص طور پر لائق تحسین ہیں۔ مسلمان دانشوروں اور سیاستدانوں کے ایک با اثر حلقے کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ مسلمانوں کو بھارت کے دوسرے شہریوں سے الگ تھلگ اپنی کوئی سیاسی تنظیم نہیں بنانی چاہئے اس طرح ایک تو وہ اکثریت کے لئے شکوک و شبہات پیدا کرنے کا ذریعہ بنتے ہیں دوسرے کوئی قابلِ ذکر سیاسی کامیابی حاصل نہ کرنے کی صورت میں وہ مسلم آبادی کے مسائل و معاملات کے حل میں بھی کوئی خاص کردار ادا نہیں کر پاتے۔ بھارتی مسلمانوں میں اس نقطۂ نظر کے ترجمان یوں تو کئی اصحاب ہیں لیکن ان میں سے میری ملاقات جن دانشوروں سے ہوئی ان میں جنتا پارٹی کے سیکرٹری جنرل سید شہاب الدین اور کانگریس (آئی) کے ایک سابق وزیر مملکت اور بمبئی کے نامور قانون دان اور مصنف ڈاکٹر رفیق ذکریا کے نام خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ڈاکٹر ذکریا کی بیگم (فاطمہ ذکریا) پہلے "السٹریٹڈ ویکلی" کے ادارۂ تحریر میں شامل تھیں آج کل ٹائمز آف انڈیا سے منسلک ہیں۔ ڈاکٹر صاحب کی "کافی پارٹی" میں (قدرتاً) وہ بھی شریک تھیں، ان کے خیالات بھی اپنے خاوند کے خیالات سے بڑی حد تک مماثلت رکھتے تھے ان دونوں حضرات کی گفتگو کا خلاصہ یہ تھا کہ ایک تو بھارت کے مسلمانوں کو اب بات بات پر پاکستان کی طرف دیکھتے رہنے کا انداز ترک کر دینا چاہئے دوسرے اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد الگ بنانے کے بجائے انہیں ملک گیر سیاسی تنظیموں میں بھرپور حصہ لے کر ان کی پالیسیوں پر اثر انداز ہونے کی کوشش کرنی چاہیے۔

بھارتی مسلمانوں میں خوش قسمتی سے بریلوی دیوبندی نزاع تو اتنا شدید نہیں جتنا یہاں پاکستان میں (یا ہمارے علماء اور مبلّغین کی برکت سے اب برطانیہ اور یورپ کے دوسرے ممالک میں) پایا جاتا ہے لیکن دارالعلوم دیوبند کے "مسئلہ اہتمام" پر خود دیوبندی حلقے میں جو اختلاف پیدا ہو گیا ہے اس کی شدّت میں ابھی تک کمی نہیں آئی، دارالعلوم دیوبند کے مہتمم حضرت مولانا قاری محمد طیّب مرحوم اللہ کو پیارے ہو چکے دارالعلوم عملاً شوریٰ گروپ کی تحویل میں آ چکا لیکن اس سلسلے میں کئی مقدمے اب تک فریقین کے درمیان دیوبند کی عدالتوں میں زیرِ سماعت ہیں اور دارالعلوم میں بھی اب تک وہ علمی فضا قائم نہیں ہو سکی جو سالہا سال سے اس کا طرّۂ امتیاز چلی آ رہی تھی۔

فرقہ وارانہ نزاعات میں دوسرا مسئلہ شیعہ سنّی اختلافات کا ہے بدقسمتی سے محرّم کے ایّام میں تو لکھنؤ

اور اس کے گردونواح میں یہ نزاع اکثر پیدا ہوتا ہی ہے ان دنوں بنارس کے ایک مقدمہ کی وجہ سے ملک کے دوسرے حصوں میں بھی دونوں گروہوں کے درمیان کشیدگی پائی جاتی ہے' بنارس کا یہ مقدمہ شیعہ اور سنّیوں کے درمیان تقریباً ایک سو سال سے چل رہا ہے۔ شیعہ حضرات نے یہ دعویٰ دائر کیا تھا کہ سنّیوں نے ایک ایسی زمین میں قبریں بنادی ہیں، جو دراصل شیعہ قبرستان کی زمین ہے یہ مقدمہ چلتا رہا' چلتا رہا یہاں تک کہ اسے کم وبیش ایک سو سال ہوگئے' اب کچھ عرصہ قبل سپریم کورٹ نے شیعوں کے حق میں فیصلہ سنا دیا ہے اس فیصلے کے نتیجے میں سنّی قبروں کو شیعہ قبرستان کی زمین سے ہٹادیا جائے گا۔ ادھر سنّی برافروختہ ہیں اور اپنے مُردوں کی یہ بے حرمتی گوارا کرنے کو تیار نہیں کہ اتنے عرصہ کے بعد ان کی ہڈیاں اکھاڑ پھینکی جائیں خدا کا شکر ہے کہ علماء اور قائدینِ اہلسنّت کے علاوہ بعض انصاف پسند شیعہ علماء کو بھی مسئلہ کی نزاکت کا احساس ہے' مختلف مکاتبِ فکر کے رہنما کوشش کر رہے ہیں کہ وہ بیچ میں پڑ کر فیصلے کا نفاذ نہ ہونے دیں' مصالحانہ کوششوں کی وجہ سے سپریم کورٹ نے بھی فیصلے کا نفاذ کچھ عرصے کے لئے مؤخر کر دیا ہے۔ خدا کرے کہ یہ مصالحانہ کوششیں کامیاب ہوں اور بھارت کی سرزمین پر کلمہ گو مسلمان قبرستان میں مُردوں کی تدفین کے مسئلہ پر ایک دوسرے سے دست بگریباں نہ ہوں ورنہ بھارت تو بھارت پوری دنیا میں اسلام کے کاز کو سخت نقصان اور ضعف پہنچے گا۔
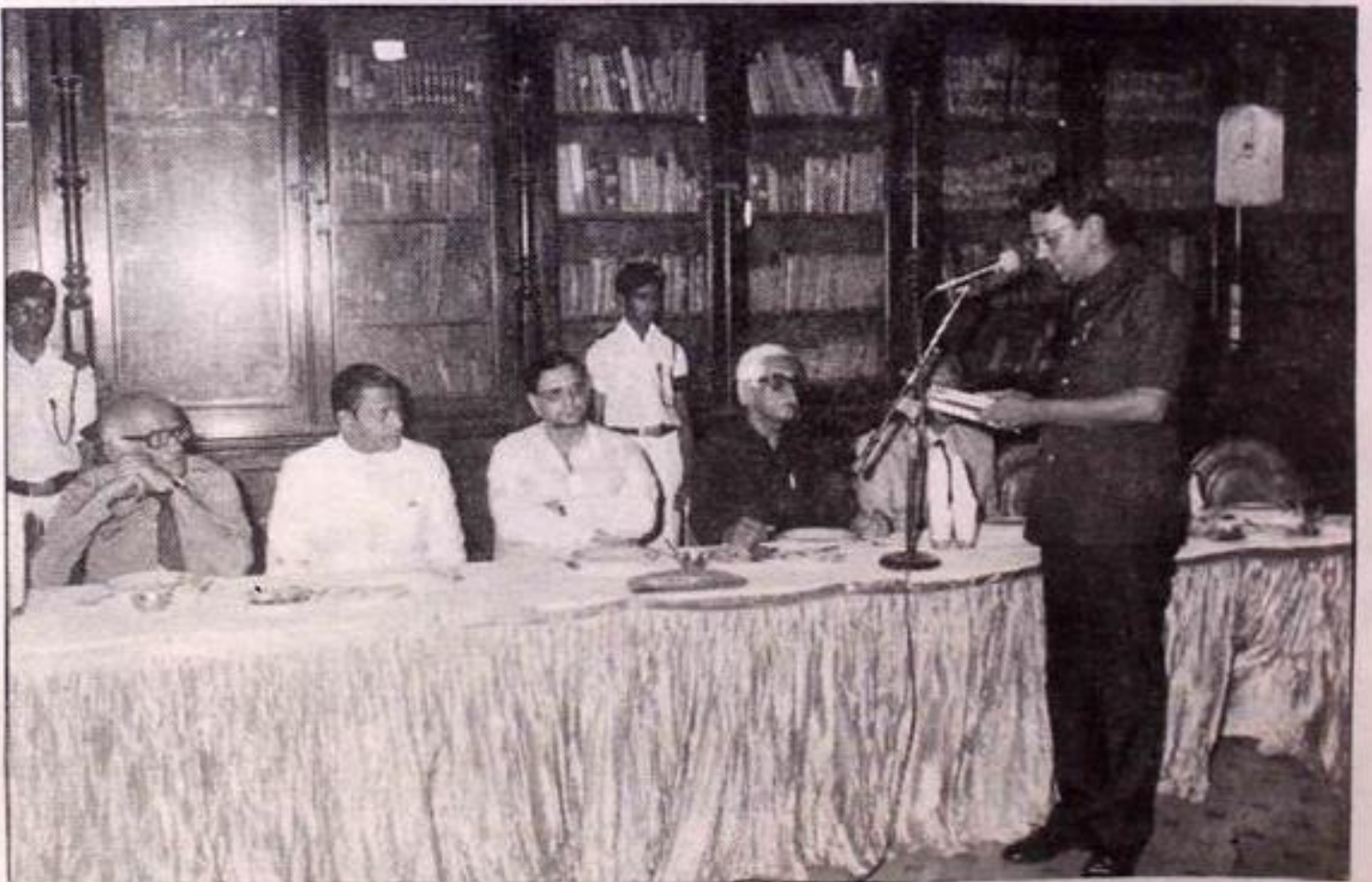
بمبئی ...... مسٹر کے۔ ایم۔ عارف انجمن اسلام کی لائبریری میں منعقدہ عشائیہ میں سپاسنامہ پیش کرتے ہوئے۔

بمبئی میں انجمن اسلام کے اسکاؤٹ مصنف کو سلامی دیتے ہوئے

بمبئی کی ایک تقریب میں مصنف اداکار دلیپ کمار سے گلے مل رہے ہیں۔

1989ء

بمبئی میں تین دن

3ر سے 5ر نومبر تک میں بمبئی میں تھا۔ دہلی کی بین الاقوامی رحمتہ اللعالمین کانفرنس میں انجمنِ اسلام بمبئی کے صدر اور صوبہ مہاراشٹر کے وزیرِ شہری ترقیات ڈاکٹر اسحاق جم خانہ والا نے بڑے خلوص اور اصرار کے ساتھ دعوت دی تھی کہ میں انجمن کے زیرِ اہتمام سیرت النبیؐ پر ان کے سالانہ لیکچر میں بطور مہمان مقرر شرکت کروں۔ یہ لیکچر انجمن کے مرحوم صدر جناب معین الدین حارث نے شروع کرائے تھے اور ان کی وفات کے بعد انہیں "معین الدین حارث میموریل لیکچر" کا نام دے دیا گیا تھا۔ اس سے پہلے سات لیکچر ہو چکے ہیں اب یہ آٹھواں لیکچر تھا جو "پیغمبرِ اسلام...... پیغمبرِ امن" کے موضوع پر مجھے دینا تھا۔

ایئرپورٹ پر انجمن کے نوجوان عہدیدار اور بمبئی کے مشہور ماہرِ اقتصادیات جناب کے ایم عارف اپنے دوسرے رفقاء کے ساتھ میرے استقبال کے لئے موجود تھے۔ میں نے انہیں بتایا کہ آپ کا نام ہمارے ہاں بھی خاصا معروف ہے ہمارے ہاں کے 'کے ایم عارف' ہماری مسلح افواج کے کمانڈر انچیف تھے اور آج کل پاکستان کے مشہور شاعر ہیں۔ انہوں نے جنرل ضیاء الحق کے مارشل لاء اور ان کے دَورِ حکومت میں بڑا اہم کردار ادا کیا ہے اور اُمید ہے اس دَور کے مردِ آہن جنرل چشتی کی طرح انہوں نے اپنی یادداشتیں قلمبند کیں تو مستقبل کے مؤرخ ان سے بے حد استفادہ کریں گے۔ اس انکشاف سے وہ خاصے محظوظ ہوئے۔

ہمارا قیام بمبئی کے مشہور ہوٹل "تاج" میں تھا۔ یہ "انٹر کانٹی نینٹلوں" کے سلسلے ہی کا ہوٹل ہے لیکن شاید دنیا بھر میں استنبول کے انٹر کانٹی نینٹل کو چھوڑ کر اپنا جواب نہیں رکھتا' اس کا پرانا بلاک تو

خاص طور پر کسی محل کی مانند ہے میں نے بھی ٹھہرنے کے لئے یہی حصہ منتخب کیا۔ تاج سمندر کے کنارے واقع ہے اور یہیں اس کے پاس انڈیا گیٹ بھی ہے جسے دیکھنے کے لئے رات دن سیاحوں کی بھیڑ لگی رہتی ہے۔ سامنے حدِ نظر تک پھیلا ہوا سمندر عجب بہار دکھا رہا ہے اور اس کے تین طرف اونچی اونچی عمارتیں۔ لگتا ہے جیسے ہم ہانگ کانگ میں آ گئے ہوں۔ ایئر پورٹ سے تاج تک پورا ایک گھنٹہ لگ جاتا ہے ایک تو ہوٹل ویسے ہی دُور ہے دوسرے بمبئی کا پھیلاؤ اور ٹریفک...... الامان والحفیظ۔ کئی اور پہلوؤں کی طرح یہ اپنے بے ہنگم ٹریفک میں بھی کراچی سے خاصی مماثلت رکھتا ہے فرق اتنا ہے کہ اس میں شہر کے ایک حصے سے دوسرے حصے تک لے جانے کے لئے ریل چلتی ہے جس سے روزانہ کم و بیش تیس لاکھ افراد سفر کرتے ہیں۔ سرکاری بسیں اس کے علاوہ ہیں جو اوسطاً دو لاکھ مسافروں کو "ڈھونے" کا فرض انجام دیتی ہیں۔ اب بمبئی کے نئے اور پرانے حصے کے سفر کو کم کرنے اور باہم دگر مربوط کرنے کے لئے سمندر میں کئی کلو میٹر کی ایک ٹنل (پختہ سرنگ) تعمیر کی جا رہی ہے جس سے فاصلہ کافی سکڑ جائے گا۔ اس منصوبے پر تقریباً پانچ سو کروڑ روپے خرچ آئیں گے اور یہ پراجیکٹ ہمارے دوست ڈاکٹر اسحاق جم خانہ والا کی وزارت ہی کے زیرِ نگرانی پایۂ تکمیل کو پہنچ رہا ہے۔ بمبئی کی آبادی ایک کروڑ سے اوپر ہے اور اس میں رہائشی مسئلہ اتنا اُلجھ گیا ہے کہ اب بھی رات کو ہزار ہا لوگ فٹ پاتھوں اور فلیٹوں کے باہر یہاں تک کہ زینوں میں سوئے نظر آتے ہیں مگر بحیثیت مجموعی اس شہر کا اپنا ایک طلسم ہے اور کوئی شخص اس کا اسیر ہونے کے بعد کسی دوسرے شہر میں آباد نہیں ہو سکتا۔

دوپہر کو ہندوستان کے مشہور ادیب اور فلموں اور ٹیلی ویژن کے مقبول کہانی نگار جناب ڈاکٹر معصوم رضا کا لنچ تھا۔ ڈاکٹر صاحب کے قلم سے ٹیلی ویژن پر دکھائی جانے والی مہابھارت سیریز کا آج کل پورے ہندوستان میں طوطی بول رہا ہے۔ یہ ہفتہ وار پروگرام ہے، جو بھارت کی قدیم جنگ مہابھارت کی داستان پر مبنی ہے۔ کہتے ہیں کہ شروع میں اس مشہورِ عالم رزمیہ میں آٹھ ہزار اشعار تھے، جو بعد میں بڑھتے بڑھتے ایک لاکھ تک پہنچ گئے ہیں۔ ظاہر ہے چار ہزار سال پہلے کے واقعہ کی جزئیات اتنی مصدقہ تو نہیں ہو سکتیں مگر ڈاکٹر رضا کے بقول "رائی ہو تبھی پربت بنتا ہے" انہوں نے بتایا کہ ایک ہندو ادارہ تقریباً پچاس سال سے مہابھارت کے موضوع پر ریسرچ کر رہا ہے جس نے اب تک چھپنے والے مہابھارت کے سب نسخے جمع کئے ہیں مگر مشکل یہ ہے کہ ان میں سے کوئی نسخہ دوسرے سے نہیں ملتا۔

کوروؤں اور پانڈوؤں میں ہونے والی اس جنگ کے دوران مشہور تیر انداز ارجن کو کرشن مہاراج نے جو طویل اُپدیش دیا تھا اسی کا نام بھگوت گیتا ہے اور یہ ہندو مذہب میں متبرک ترین کتاب کا درجہ رکھتی ہے آج بھی عدالتوں میں گواہ کو یہی کتاب ہاتھ میں لینے اور اس پر قسم کھانے کے بعد گواہی کے لائق سمجھا جاتا ہے شاید یہی وجہ تھی کہ جب ایک مسلمان کے قلم سے بھارتی دُور دَرشن پر یہ سیریز شروع ہوئیں تو ایک ہندو جماعت نے دُور دَرشن کو خط لکھ کر اس پر احتجاج کیا' دُور دَرشن والوں نے یہ خط ڈاکٹر صاحب کو بھیج

دیا جنھوں نے جواب میں لکھا کہ میں بھگوت گیتا پر نہیں لکھ رہا میں تو مہابھارت کی کہانی پر لکھ رہا ہوں اور مہابھارت کی کہانی بھارت میں رہنے والے سبھی لوگوں کا مشترک اثاثہ ہے اس پر احتجاج کرنے والوں نے اپنا احتجاج واپس لے لیا۔ ''مہابھارت'' کا سلسلہ دُور دَرشن پر اتنا مقبول ہے کہ شاید ہی اس کا کوئی دوسرا پروگرام اب تک اتنا مقبول ہوا ہو۔ یہ ہر ہفتے اتوار کی صبح کو ٹیلی کاسٹ ہوتا ہے اور بلا مبالغہ اس وقت بھارت میں تمام کام معطل ہو جاتے ہیں جو جہاں ہے ٹیلی ویژن کے قریب بیٹھ جاتا ہے حد یہ ہے کہ کابینہ کے اجلاس تک اس وقت نہیں رکھے جاتے اگر کوئی ہنگامی اجلاس ہو بھی جائے تو پروگرام ریکارڈ کر لیا جاتا ہے تاکہ کابینہ کے اراکین بعد میں اسے دیکھ سکیں۔

لنچ میں مشہور ترقی پسند شاعر علی سردار جعفری بھی اپنی بیگم کے ساتھ مدعو تھے اور حضرت جوش ملیح آبادی کی دوستی کے ناطے وہ مجھ سے خاصی واقفیت رکھتے تھے۔ میں نے انہیں بتایا کہ جوش میموریل کمیٹی اس مرتبہ حضرت جوش کی برسی پر 22 ر فروری کو ایک پاک ہند مشاعرہ منعقد کرنے کا پروگرام رکھتی ہے اس میں آپ ضرور تشریف لائیں۔ کہنے لگے ضرور آؤں گا مگر میرے علاوہ مجروح سلطان پوری، جگن ناتھ آزاد اور کنور مہندر سنگھ بیدی کو بھی بلائیے کہ وہ بھی جوش صاحب کے بہت قریب تھے۔

جوش میموریل کمیٹی جوش صاحب کی وفات کے بعد بڑے مشکل حالات میں قائم ہوئی تھی، دوستوں نے مجھے اس کا چیئرمین منتخب کر لیا ان دنوں میں بار بار ان سے کہہ رہا ہوں کہ اب حکومت کی تبدیلی سے آپ حضرات کے لئے ماحول ساز گار ہے جوش صاحب کی برسی وغیرہ کی تقریبات کے لئے آپ کو سرکاری اداروں کا تعاون حاصل ہو سکتا ہے مگر میرے ہوتے حکومت کو کمیٹی کی سرپرستی میں دقت ہو گی اس لئے میرا استعفیٰ منظور کر لیجئے۔ ابھی تک احباب اپنی ضد پر اڑے ہوئے ہیں مگر میں حکومتی کاروبار سے زیادہ واقف ہوں انہیں میری بات ماننی ہی پڑے گی۔

جعفری صاحب ترقی پسند تحریک کے بانیوں میں شامل ہیں اور انقلابی شاعری میں اپنا ایک خاص مقام رکھتے ہیں انہیں دیکھ کر سیّد سبطِ حسن مرحوم یاد آ گئے۔ سیّد صاحب یوں تو مغربی لباس بھی پہنتے تھے اور وہ بھی ان پر خوب جچتا تھا مگر بے تکلف محفلوں میں لکھنوی کُرتے پاجامے ہی میں ملبوس نظر آتے، ان کا اور ہمارا ساتھ 53ء میں سنٹرل جیل لاہور میں کئی ماہ تک رہا جہاں وہ اور ہم ایک ساتھ نظر بند تھے۔ میری عمر اس وقت سترہ برس تھی اور میں جیل میں موجود تمام بزرگوں سے سیکھنے کے موڈ میں تھا اور یہ میری خوش قسمتی ہے کہ اس زمانے میں، میں نے مولانا سیّد ابوالاعلیٰ مودودی مرحوم، مولانا امین احسن اصلاحی، شیخ الحدیث مولانا محمد اسماعیل اور سیّد عطاء اللہ شاہ بخاری سے لے کر سیّد سبط حسن تک کتنے ہی اہلِ کمال کا فیضِ صحبت اٹھایا۔ سیّد صاحب کٹر کمیونسٹ تھے مگر بہت پڑھے لکھے اور شائستہ انسان۔ اسلامی تاریخ اور علوم کا بھی وسیع مطالعہ رکھتے تھے ان سے خوب خوب بحثیں رہیں اور مجھے یہ کہنے میں تامل نہیں کہ میں نے ان کی علمی مجالس سے خاصا استفادہ کیا۔ جعفری صاحب ملے تو مجھے بے ساختہ سیّد سبط حسن مرحوم کی

یاد آ گئی ، وہی اندازِ تکلم ، وہی وضع قطع اور وہی تبحرِ علمی ؎ "غالبؔ ندیم دوست سے آتی ہے بوئے دوست"
بلکہ یہ مصرعہ تو خود جعفری صاحب نے مجھ سے گرمجوشی کے ساتھ معانقہ کرتے ہوئے دہرایا
اور جوش اور سبطِ حسن کی دوستی کا حوالہ دیتے ہوئے دہرایا۔ علی سردار جعفری بھی آج کل دُور درشن کے
لئے کام کر رہے ہیں (ویسے وہ بمبئی کی اُردو اکیڈمی کے ڈائریکٹر ہیں) اور سات بڑے شاعروں پر فیچر
فلموں کی تیاری کا کام ان کے سُپرد ہے۔ ان سات میں سے ایک نام بھول رہا ہوں باقی چھ جوشؔ ، جگرؔ
فراقؔ ، فیضؔ ، مجازؔ اور حسرت موہانیؔ ہیں۔ جوشؔ مرحوم پر اپنے سکرپٹ کے کچھ حصے زبانی سناتے رہے ان
کے بارے میں گفتگو کرتے ہوئے ان کا لہجہ بڑا عقیدت آمیز تھا کہنے لگے پاکستان کے ایک دوست نے مجھ
سے پوچھا فیض اور جوش میں کیا فرق ہے۔ میں نے کہا جوش ایک چھتناور اور تناور درخت ہے جو فضا میں
معلق ہے زمین میں جڑیں نہیں رکھتا اور فیض پہلے سے آراستہ پیراستہ ایک سرسبز و شاداب باغ میں چمپا کا
پھول ہے جس کی مہک پورے گلشن میں پھیلی ہوئی ہے۔ ان کے کہنے کا مطلب یہ تھا کہ جوشؔ ہندوستان
سے چلے گئے (اور ویسے بھی اُردو معاشرہ ہندوستان میں ختم ہو گیا) اور پاکستان کی سیاست نے انہیں قبول
نہ کیا وہاں سے جڑیں اکھڑیں اور پاکستان میں جم نہ سکیں اس لئے ان کی جڑیں زمین میں نہیں ویسے وہ ایک
بہت بڑے درخت اور فیض گو اس درخت کے مقابلے میں چمپا کا ایک پھول ہیں مگر فضا ان کے لئے ساز گار
تھی پاکستانی معاشرہ اُردو معاشرہ بن چکا تھا اس لئے یہاں وہ خود بھی مہکا اور اس نے گلشن کو بھی مہکا دیا۔
جعفری صاحب فیض کی دوستی کے بڑے مدّاح اور معترف تھے مگر جوشؔ کو وہ اپنا اُستاد کہہ کر یاد کرتے تھے۔
کہنے لگے کسی شاعر کے کلام کو چمکانے میں مخصوص سیاسی اور سماجی ماحول کا بھی بڑا دخل ہے۔ ہمارے ہاں
مجروحؔ سلطان پوری نے بڑے معرکے کا شعر کہا ہے (کہ پاکستان کی پوری انقلابی شاعری پر بھاری ہے) ؎

ستونِ دار پہ رکھتے چلو سروں کے چراغ
جہاں تلک بھی ستم کی سیاہ رات چلے

مگر ہندوستان کی جمہوری فضا میں یہ بے معنی بن کر رہ گیا ہے اور مارشل لاء کے ماحول میں فیض کا تنہا
یہ مصرعہ بڑا موثر اور معنی خیز حیثیت کا حامل ہے کہ ؎

ترے عہد میں دلِ زار کے سبھی اختیار چلے گئے

جوش اور فیض کے بعد پاکستان اور ہندوستان کی موجودہ شاعری پر بات چل نکلی۔ جعفری صاحب کراچی کی
ایک شاعرہ 'عشرت آفرین' کے بڑے مدّاح تھے ان کے مجموعۂ کلام پر انہوں نے دیباچہ بھی لکھا ہے۔
پاکستان کی مشہور شاعرہ 'پروین شاکر' کا بھی ذکر آیا۔ جعفری صاحب نے بتایا کہ پروین شاکر امریکہ کے
مشاعروں میں ان کے ساتھ تھیں۔ اچھا شعر کہتی ہیں ایک شعر اکثر پڑھتی تھیں اور اس کے لئے ہم سے داد
کی بھی طلب گار تھیں۔

ایک مشت خاک ، وہ بھی آندھیوں کی زد میں ہے
آدمی کی بے بسی کا استعارہ دیکھنا

میں نے کہا ہمارے ہاں کے شاعر وحید اختر کا شعر سنو اور پھر انصاف کرو کون سا شعر زیادہ اچھا ہے۔

کون یہ ریت کی اُڑتی ہوئی دیواروں پہ
لکھ رہا ہے یہ زمیں میری یہ گھر میرا ہے

ڈاکٹر راہی کی بیگم لنچ تک کسی کام سے گھر سے باہر تھیں ان کی ہونہار اور سلیقہ شعار بیٹی مریم نے لنچ کا سارا بندوبست کیا یوں تو سارے ہی کھانے مزے کے تھے مگر ان میں بہاری کباب اور چنوں کا حلوہ خاص طور پر لاجواب تھے۔ کھانے کے دوران بیچ بیچ میں ڈاکٹر صاحب کی گُل افشانیٔ گفتار اپنی جگہ نُقلِ محفل کا کام دے رہی تھی۔ اُردو کے شعری سرمائے پر بھی ڈاکٹر صاحب کی گہری نظر ہے۔ اُردو مرثیہ پر بات چلی تو سیاسی اور سماجی حالات کی اثر پذیری کے حوالے سے انہوں نے بڑی وقیع باتیں کہیں۔ کہنے لگے مرثیہ کی شروعات دکن میں ہوئی مگر اس دَور کے مرثیے دیکھیے تو ان میں آپ کو صرف رونا رُلانا نظر آئے گا اور ان میں کردار بھی وہی نمایاں کئے گئے ہیں جو اس مقصد میں ممد و معاون ثابت ہو سکتے ہیں جیسے سکینہ اور اصغر' بعد میں مرثیہ لکھنؤ پہنچا تو ہمیں انگریزوں سے جنگیں درپیش تھیں۔ غیر ملکی سامراج کے مقابلے میں جذبات کھَولے ہوئے تھے۔ اب مرثیہ میں ہیرو اور اس کی جنگ پر زور دیا جانے لگا۔ ان مرثیوں میں حسینؓ 'اکبرؓ' حرؓ' عباسؓ ہیرو ہیں اور ان کی لڑائی کا بھرپُور ذکر ہے۔ آج کل وہ مہابھارت کی سیریز لکھ رہے ہیں اس لئے ہندی اور سنسکرت کے لٹریچر پر بھی انہیں عبور حاصل ہے۔ رامائن (رام چندر جی کی کہانی) کی بات ہوئی تو کہا بالمیک اور تُلسی داس کی رامائنوں میں بھی حالات کے زیرِ اثر اسی طرح کا فرق نظر آتا ہے۔ بالمیک کی رامائن میں رام ایک شہزادہ ہے اور ایک سعادت مند بیٹا مگر تُلسی داس کی رامائن میں اسے ایک اَوتار کے روپ میں پیش کیا گیا ہے۔ سبب یہ ہے کہ تُلسی داس کے زمانے میں ویدانت کا چرچا تھا اور اس میں کہانی کے لئے ایک ایسے ہی ہیرو کی ضرورت تھی جسے روحانیت کا پیکر بنا کر پیش کیا جائے۔

....

عصر کے بعد انجمنِ اسلام کے دفاتر کے باہر وسیع لان میں میرا لیکچر تھا۔ اس کی پبلسٹی تین دن سے ہو رہی تھی۔ دعوت ناموں کے علاوہ بمبئی کے دو با اثر اردو اخبارات "انقلاب" اور "اُردو ٹائمز" صفحہ اوّل پر اس کا اشتہار چھاپ رہے تھے۔ "ٹوڈے" انگریزی زبان کا سب سے بڑا شام کا اخبار ہے اس میں بھی اشتہار تھا۔ مہاراشٹر کے گورنر اور علاقے کے معمر سیاستدان جناب برہما ریڈی لیکچر کی صدارت کر رہے تھے۔ وہ اس سے پہلے مرکزی وزیر اور آندھرا پردیش (حیدر آباد دکن) کے وزیر اعلیٰ بھی رہ چکے ہیں۔ سٹیج کو بہت باوقار طریقے سے سجایا گیا تھا اس کے پیچھے اردو اور انگریزی زبان میں لیکچر کا موضوع اور مقرّر کا نام بڑے بڑے بینرز کی صورت میں آویزاں تھا۔ میں وقت سے پانچ منٹ پہلے پہنچا تو گورنر صاحب تشریف لا چکے تھے اور آدھا لان بھر چکا تھا۔ ہمارے پاکستان کی اہلحدیث یوتھ فورس کے مخلص اور پُرجوش رہنما رانا شفیق احمد خان پسروری بھی اتفاق سے ان دنوں بمبئی میں تھے۔ میرے لیکچر کا سنا تو وہ بھی تشریف

لے آئے جلسہ ٹھیک وقت پر شروع ہوا اور دیکھتے ہی دیکھتے لان میں رکھی ہوئی ایک ہزار کرسیاں بھر گئیں اور لوگ کرسیوں کے پیچھے دائیں بائیں ایستادہ ہونے لگے۔ خواتین کی بھی ایک معقول تعداد موجود تھی۔ آج ہر مکتبِ فکر کے مسلمان یہاں جمع تھے۔ شیعہ حضرات کے رہنما مولانا عباس رضوی ' بھارت میں پرنس کریم خاں کے نمائندۂ خاص مسٹر پردھان ' بوہرہ کمیونٹی کے انچارج تعلقاتِ عامہ جناب اقتدار حسین ' دیوبندی مکتبِ فکر کے مولانا حامد الانصاری غازی اور قاری زبیر عثمانی ' مشہور صحافی اور ادیب ظ انصاری خلش جعفری اور ہارون رشید علیگ ' ممتاز بنکار مسٹر زین رنگون والا بمت سے سابق صوبائی وزیر اور عمائدینِ شہران کے علاوہ تھے۔ بھارتی مسلمانوں کے جلسوں کی ایک خصوصیت سٹیج پر مہمانوں کی گل پوشی ہے۔ سٹیج سے اعلان ہوتا ہے اور مہمانانِ خصوصی کی خدمت میں مختلف حضرات (وہ بھی ناموں کے اعلان کے ساتھ) پھولوں کے گل دستے پیش کرتے جاتے ہیں۔ اس سے پہلے تمام حاضرین میں آج کے لیکچر کے بارے میں دبیز آرٹ پیپر پر چھپا ہوا چار ورقی تعارفی بروشر بھی تقسیم ہوا۔ اس میں ایک صفحہ لیکچر کے موضوع ' مقرر کے تعارف اور اس کی دوسری تفصیلات کے لئے وقف تھا باقی دو صفحوں پر انجمنِ اسلام کا تعارف پیش کیا گیا تھا۔

" انجمنِ اسلام بمبئی " بھارت کی قدیم ترین انجمن ہے۔ یہ کم و بیش انہی دنوں میں قائم ہوئی ہے جب سر سید احمد خاں مرحوم نے مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کی بنیاد رکھی۔ 21 فروری 1874ء کو (آج سے ایک سو پندرہ سال پہلے) بمبئی کے کچھ تعلیم یافتہ مسلمان اکٹھے ہوئے ان کے لیڈر بدرالدین طیب جی تھے جو بعد میں برطانوی ہند میں پہلے ہندوستانی جج مقرر ہوئے۔ اجلاس میں مسلمانانِ بمبئی کی تعلیمی اور سماجی فلاح و بہبود کے لئے انجمنِ اسلام کا قیام عمل میں آیا اس کے بانی اراکین کی تعداد 21 تھی اور پہلے اجلاس میں کام کو آگے بڑھانے کے لئے 1497 روپے کا فنڈ اکٹھا ہوا۔ اپنے قیام کے ایک ہی سال بعد انجمن نے ملکہ وکٹوریہ کو ایک محضرنامہ پیش کیا جس میں عالمی طاقتوں کی طرف سے خلافتِ عثمانیہ کو ختم کرنے کی کوششوں پر غم و غصّے کا اظہار کیا گیا۔ 1876ء میں انجمن نے پہلی قسط کے طور پر ترکی کے سپاہیوں اور بیواؤں اور یتیموں کی مدد کے لئے دس ہزار روپے کا عطیہ ارسال کیا۔ آج خدا کے فضل و کرم سے انجمن کے زیرِ اہتمام تیس تعلیمی اور فنی ادارے کام کر رہے ہیں جن میں میڈیکل کالج ' انجینئرنگ کالج ' گرلز کالج ' طبیّہ کالج اور لڑکوں اور لڑکیوں کے لئے کئی ہائی سکول شامل ہیں۔

انجمن کا سالانہ بجٹ اس وقت چار کروڑ روپے ہے۔ انجمن کو فخر حاصل ہے کہ قائداعظم محمد علی جناحؒ بھی اس کے ایک سابق طالبعلم رہ چکے ہیں۔ قائداعظمؒ کے ایک بھانجے جناب اکبر پیر بھائی کئی سال تک انجمن کے صدر تھے۔ پچھلے کئی سال سے اس کے صدر ڈاکٹر اسحٰق جمخانہ والا ہیں جو مہاراشٹر گورنمنٹ میں وزیرِ شہری ترقیات اور اوقاف بھی ہیں۔ ڈاکٹر صاحب بڑی دلکش شخصیت کے مالک ' پکے مسلمان اور ایک صاحبِ نظر سیاستدان ہیں۔ بمبئی کے مسلمان ان سے بے حد پیار کرتے ہیں اور وہ بھی

رات دن خدمتِ خلق کے کاموں میں مصروف رہتے ہیں۔

مولانا قاری زبیر عثمانی کی تلاوت کے بعد ڈاکٹر اسحٰق صاحب نے انجمن کی طرف سے میرے لئے خیر مقدمی کلمات کہے پھر گورنر صاحب نے اپنی لکھی ہوئی تقریر پڑھی اور پھر مجھے حکم کلام ہُوا۔ کُل 45 منٹ تھے اور مغرب کی نماز تک مجھے اپنی تقریر ختم کرنی تھی۔ میں نے کہا "مجھے حکم ہُوا ہے کہ ذرّے میں صحرا کی وُسعتیں سمیٹوں، قطرے میں سمندر دکھاؤں، کوزے میں دریا کو بند کروں اور صدیوں کا سفر لمحوں میں طے کروں" مگر خدا کا شکر ہے کہ جس ذاتِ اقدسؐ پر گفتگو تھی اسی کے اعجاز سے یہ مشکل مرحلہ حسن وخوبی سے طے ہُوا۔ تقریر کا وڈیو کیسٹ بنا اور اب اسے کتابچے کی صورت میں بھی انجمن کی طرف سے شائع کیا جائے گا۔ جلسے کے بعد انجمن کی طرف سے عشائیہ تھا جس میں کوئی سو کے قریب مہمان شریک تھے۔ ٹی وی والے دیر سے پہنچے تھے ان کا اصرار تھا کہ عشائیہ ہی میں ایک دو تقریریں ہو جائیں تاکہ وہ اپنی خانہ پُری کرلیں چنانچہ ڈاکٹر اسحٰق بولے اور ان کے جواب میں لاچار مجھے بھی بولنا پڑا۔ شیطان رُشدی بمبئی ہی میں پیدا ہوا تھا اس لئے اِسی مناسبت سے کچھ گفتگو میں نے اس موضوع پر بھی کی۔ شہدائے بمبئی کو خراجِ عقیدت پیش کیا جنہوں نے شہدائے اسلام آباد کے بعد ناموسِ رسولؐ کے لئے جانوں کا نذرانہ پیش کیا۔ بھارتی حکومت کا شکریہ ادا کیا جس نے سب سے پہلے اس ناپاک کتاب پر پابندی عائد کی۔ عشائیہ کے بعد ڈاکٹر صاحب اپنی پرچم بردار اور سائرن گفتار گاڑی میں مجھے بمبئی کی ڈرائیو پر لے چلے۔ وہ جگہ دکھائی جہاں قائداعظمؒ نے لندن سے آنے کے بعد پہلی مرتبہ جلسہ سے خطاب کیا تھا۔ ڈاکٹر صاحب نے بتایا کہ جب قائداعظمؒ جلسہ گاہ میں پہنچے تو پوچھا "کیا یہاں اخبار نویس موجود ہیں؟" جواب دیا گیا "نہیں" فرمایا "تو پھر کیا میں گدھوں سے خطاب کروں گا" یہ گویا عصرِ حاضر کی اجتماعیات میں قائداعظمؒ کی طرف سے پروپیگنڈے اور پبلسٹی کی اہمیت کا اظہار تھا۔ انفرادی زندگی میں تو "نیکی کر دریا میں ڈال" کا اصول برحق ہے مگر اجتماعی زندگی میں تو "نیکی کر اور دریا میں اُچھال" ہی صحیح ہے بلکہ اب تو یار لوگ نیکی کرنے کی ضرورت بھی محسوس نہیں کرتے صرف اسے اُچھالتے ہی رہتے ہیں۔

بمبئی کا "بھنڈی بازار" بھی دیکھا یوں سمجھیے یہ یہاں کا "لالوکھیت" ہے اس کے قریب ہی عجیب وغریب ناموں کے تین مشہور ہوٹل ہیں "مکہ شریف" یہاں تمام لوازمات کے ساتھ صبح کا ناشتہ تناول فرمایئے۔ "مدینہ شریف" یہاں ڈٹ کر دوپہر کا کھانا کھایئے اور پھر رات کے طعام کے لئے "پیراڈائز" (بہشتِ بریں) میں تشریف لے چلئے کہ رہی سہی کسر وہاں پوری ہو جائے گی۔

اب ڈاکٹر صاحب نے گاڑی موڑی اور حضرت حاجی علیؒ کے مزار کی طرف چلے۔ حضرت حاجی علیؒ کا مزار سمندر میں واقع ہے دونوں طرف پانی ہے بیچ میں خشک راستہ جس کے دونوں جانب دکانیں لگتی اور باجماعت گداگر بیٹھتے ہیں۔ میں نے گداگروں کی اتنی منظم ٹولی پہلے کہیں نہیں دیکھی اس میں ہر طرح کا

مانگنے والا شامل ہے۔ ہٹا کٹا اور تندرست و توانا بھی اور لنگڑا لولا بھی، ہندو بھی اور مسلمان بھی، باریش بھی اور داڑھی منڈا بھی، ریزگاری دو تو آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھیں گے نوٹ دو تو دعائیں ملیں گی۔ حضرت حاجی علیؒ سینکڑوں سال پہلے بمبئی آئے تھے، کہتے ہیں اس علاقے میں اسلام انہی کی وجہ سے پھیلا، بدقسمتی سے تلاش کے باوجود ان کی زندگی پر کوئی کتابچہ دستیاب نہ ہو سکا۔ بمبئی کے اہلِ علم کی ذمہ داری ہے کہ ان کی زندگی پر ریسرچ کریں ایک ایسی زیارت گاہ جس پر روزانہ ہزاروں لوگ بلا لحاظ مذہب و ملت حاضری دیتے ہیں اسے گمنامی کے پردے سے نکالنا ان کا فرضِ منصبی ہونا چاہیے۔

حضرت حاجی علیؒ کے خوبصورت مزار کی طرف جانے کے لئے سڑک سے جہاں رستہ شروع ہوتا ہے وہاں پھلوں کے تازہ رس کی ایک بڑی مشہور دکان ہے۔ ڈاکٹر صاحب اس کے مالک سے مجھے بطورِ خاص ملانا چاہتے تھے۔ یہ سفید ریش مگر چاق و چوبند اور سُرخ و سفید بزرگ محمد امین خان (خان بابا) سوات سے تعلق رکھتے ہیں اور ڈاکٹر صاحب ان کے خلوص کی وجہ سے ان سے بہت بے تکلف ہیں۔ خان صاحب نے اپنی دکان کے پیچھے سمندر کے اندر سرکاری زمین پر گیارہ سال سے ایک خوبصورت مسجد بنا رکھی ہے کبھی کبھی جب سمندر جولانی پر ہوتا ہے تو اس کا پانی مسجد کے اندر بھی آ جاتا ہے۔ خان صاحب سالوں سے اس کوشش میں لگے ہوئے ہیں کہ سرکاری طور پر مسجد کی منظوری مل جائے اب بھی ڈاکٹر صاحب ملے تو ان کا وہی ایک سوال تھا" ڈاکٹر صاحب! 75 سال کا ہو گیا ہوں (اور میں نے دیکھا ان کی آنکھیں ڈبڈبائی ہوئی تھیں) میری زندگی ہی میں مسجد کی منظوری دلا دو"۔ ڈاکٹر صاحب بولے "خان صاحب! یہ بتاؤ کبھی کوئی اسے گرانے آیا؟" اور پھر خان صاحب کو چھیڑتے ہوئے کہا "خان! اسے کوئی کیسے گرا سکتا ہے یاد نہیں تم نے مجھے پانچ سال پہلے چاکلیٹ کا ایک ڈبہ رشوت کے طور پر دیا تھا آخر اسے بھی تو حلال کرنا ہے" اور پھر ہر چہار طرف قہقہے بکھر گئے۔ خان صاحب میرے آنے سے بہت خوش تھے، میں خود ان کی شخصیت میں نورانیت دیکھ رہا تھا۔ بمبئی کے ایک اور وزیر کا قصہ سنایا کہ وہ اس کالج کا پروفیسر رہ چکا تھا جس کو چلانے والے ٹرسٹ کے ایک ٹرسٹی وہ خود بھی تھے۔ ان کے وزیر ہونے کا سنا تو انہیں ہار ڈالنے گئے۔ اتفاق سے وزیر صاحب لفٹ ہی میں مل گئے۔ خان صاحب نے فرمائش کی "صاحب! ہماری مسجد میں آ جایا کرو" وزیر صاحب نخوت سے بولے "میں نہیں آ سکتا بس کبھی کبھی آنے کی کوشش کروں گا" "تو پھر کبھی کبھی بھی مت آنا، مسجد کو اس مہربانی کی ضرورت نہیں" یہ کہا اور خان بابا ہار لیکر واپس آ گئے۔ کہنے لگے اب الیکشن کے قریب وہی وزیر صاحب آئے تھے اور معافی مانگ رہے تھے کہ "خان صاحب! ہم سے غلطی ہو گیا ہم کا معافی دیدو" میں نے خان بابا سے پوچھا "آپ کبھی پاکستان آئے ہیں؟ آپ کی ریاست سوات تو بڑی خوبصورت جگہ ہے" کہنے لگے "سوات تو خوبصورت ہے مگر اُدھر رہنے والا لوگ خوبصورت نہیں ہے ہزار دو ہزار کی وجہ سے جان لے لیتا ہے۔ ہم 37ء سے اِدھر آ گیا پھر کبھی واپس نہیں گیا"۔ "مگر کیا اِدھر چوری ڈکیتی نہیں ہوتی" کہا "ہوتا ہے مگر اتنا کم قیمت پر نہیں ہوتا" اس سال خان صاحب حج

کا ارادہ رکھتے ہیں۔ میری ترغیب پر سعودی عرب سے ایک ہفتے کے لئے پاکستان آنے پر بھی رضامند ہوگئے ہیں۔ خدا کرے سوات کے لوگ انہیں مایوس نہ کریں۔ ہم واپس چلے تو ڈاکٹر صاحب کہنے لگے "آپ کا کیا اندازہ ہے خان صاحب کی دکان سے پھلوں کے رَس کی روزانہ سیل کیا ہوگی" میں نے کہا "یہی کوئی ہزار دو ہزار" کہنے لگے "یہاں روزانہ تیس ہزار کی سیل ہوتی ہے۔ نو لاکھ روپے ماہوار خان صاحب کی آمدنی ہے اور اس آمدنی کا بڑا حصہ وہ اپنی مسجد اور اس کے امام و خطیب اور نمازیوں پر خرچ کردیتے ہیں"۔

اگلے دن سہ پہر تک کا وقت مختلف اخبارات کو انٹرویو دیتے گزرا' اس میں بمبئ کے مشہور انگریزی روزنامے ٹائمز آف انڈیا' انڈی پنڈنٹ' انڈین پوسٹ اور فری پوسٹ جرنل سے لیکر اُردو ویکلی بلٹز سب شامل تھے' پاکستان میں اپوزیشن کی طرف سے تحریکِ عدم اعتماد کی وجہ سے بھارت کے پڑھے لکھے اور سیاسی حلقوں میں خاصی ہلچل تھی' سرکاری ذرائع ابلاغ تو خیر کھلم کھلا بے نظیر کا ساتھ دے ہی رہے تھے۔ آزاد پریس بھی اس کو آمریت اور جمہوریت کی جنگ بنا کر دکھا رہا تھا' فضا یہ تھی گویا یہ تحریک کامیاب ہوگئی تو پاکستان میں جمہوریت کا خاتمہ ہوجائے گا۔ جمہوریت کو کوئی خطرہ لاحق نہیں کیونکہ یہ اقدام بھی عین آئین کے مطابق ہے۔ فرض کیجیے یہ تجربہ کامیاب ہوتا ہے اور بے نظیر حکومت تبدیل ہوجاتی ہے۔ تو اس سے تاریخ بنے گی کیونکہ پہلی مرتبہ آئینی طریقے سے "بلٹ" (گولی) کے بجائے "بیلٹ" (ووٹ) سے حکومت بدلنے کی نظیر قائم ہوگی اور اگر ناکام ہوتا ہے تب بھی حکومت کو اس سے احتسابی طاقت کے مضبوط ہونے کا احساس ہوگا اور وہ اپنی کارگزاری کو بہتر بنانے کی کوشش کرے گی۔

سہ پہر کو "انڈین کونسل فار ورلڈ افیئرز" کے زیرِ اہتمام "پاکستان ٹوڈے" کے موضوع پر میرا لیکچر تھا' یہ بین الاقوامی امور پر بھارتی دانشوروں اور ماہرین کا ایک قدیم فورم ہے' اجتماع میں بمبئ کے وکلاء' صحافی' سیاستدان' ممتاز تاجر اور ہر شعبۂ زندگی کے نمائندہ افراد شریک تھے۔ آدھا گھنٹہ میں نے اظہارِ خیال کیا اور پھر سوال جواب کا سیشن ہوا جو ایک گھنٹے پر پھیل گیا۔ میں نے دیکھا کہ پاکستان کے حالات کے بارے میں یہاں کے "باخبر" حلقوں میں بھی خاصی "بے خبری" پائی جاتی ہے شاید اس کا سبب یہ بھی ہے کہ پاکستان اور بھارت کے درمیان نہ تو اخبارات و جرائد کا تبادلہ ہوتا ہے نہ لٹریچر کا اور جب "انفارمیشن" نہیں پہنچتی تو اس کی جگہ "ڈس انفارمیشن" لے لیتی ہے میری سمجھ میں آج تک نہیں آیا کہ آخر دونوں حکومتوں نے "چھپنے والی باتوں" پر کیوں پابندی لگا رکھی ہے۔ خاص طور پر اس صورت میں جب "چھپنے والی باتیں" دونوں ملکوں میں خوب خوب پھیلتی ہیں۔ ابھی سوالات کا سلسلہ جاری تھا اور کئی ہاتھ بے تابانہ اٹھے ہوئے تھے کہ کونسل کی صدر نے "شکریہ کے ووٹ" سے اجلاس کی برخاستگی کا اعلان کردیا۔

اجلاس کے بعد مجھے بمبئی کے سابق صوبائی وزیر، مشہور کانگریسی رہنما، ممتاز وکیل اور مصنف ڈاکٹر رفیق زکریا نے چائے پر بلا رکھا تھا، ان کی بیگم فاطمہ زکریا بھی بھارت کی ممتاز اخبار نویس ہیں۔ دونوں میاں بیوی میرے پرانے کرم فرما ہیں اور اس سے پہلے بھی دو مرتبہ بمبئی جانا ہوا ہے تو انہوں نے بڑے اشتیاق و اخلاص سے میری پذیرائی کی ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے ابھی حال ہی میں بے نظیر بھٹو پر ایک کتاب لکھی ہے "ٹرائل آف بے نظیر" (بے نظیر کا مقدمہ) میں نے یہ کتاب بنگلور میں اپنے ہوٹل کے بک اسٹال پر دیکھی تھی مگر مجھے یقین تھا کہ بمبئی جاؤں گا تو ڈاکٹر صاحب خود مجھے یہ کتاب پیش کریں گے چنانچہ وہی ہوا ڈاکٹر صاحب نے اپنے دستخطوں سے مزین یہ کتاب مجھے عنایت کی۔ وہ محترمہ بے نظیر کے زبردست مؤید اور مداح ہیں اور اس کتاب میں بھی انہوں نے اپنی تمام تر وکیلانہ صلاحیتیں صرف کرتے ہوئے ان اعتراضات اور تنقیدوں کا ماہرانہ دفاع کیا ہے، جو عورت کے سربراہِ مملکت ہونے نہ ہونے کے ناطے ان کی وزارتِ عظمیٰ پر کیے جاتے ہیں، ڈاکٹر صاحب نے اسلامی فقہ اور لٹریچر کا بھی وسیع مطالعہ کر رکھا ہے۔ اس لئے وہ اس کتاب میں عورت کے مسئلہ پر ایک ایک کر کے مشہور آئمہ اور عصرِ حاضر تک کے علماء کو عدالت میں بلاتے ہیں اور ان پر جرح کرتے ہیں۔ نتیجہ ظاہر ہے بے نظیر ہی کے حق میں نکلتا ہے۔ میں نے ہنستے ہوئے کہا "ڈاکٹر صاحب! اب تو آپ کو پاکستان میں شاہی مہمان بن کر کچھ دن گزار ہی لینے چاہئیں، ہماری وزیراعظم کو یہ کتاب ملے گی تو وہ یقیناً اسے پسند کریں گی"۔ کہنے لگے "کتاب ان تک پہنچ چکی ہے اور ان کی پسندیدگی کا خط بھی مجھے موصول ہو گیا ہے، وزیراعظم کے ایک مشیر روشن علی بھیم جی میرے دوست ہیں۔ انہوں نے یہ کتاب محترمہ کی خدمت میں پیش کی تھی اس پر جو خط انہوں نے بھیم جی کو لکھا وہ میں آپ کو دکھاتا ہوں" چنانچہ ڈاکٹر صاحب اندر گئے اور اس خط کی فوٹو کاپی مجھے دکھائی۔

مرشدی کے مسئلہ پر بات چلی تو ڈاکٹر صاحب نے انکشاف کیا کہ آج کل وہ "سیٹنک ورسز" کے جواب میں "قرآنک ورسز" کے نام سے ایک کتاب لکھ رہے ہیں۔ بتایا کہ اس سلسلے میں وہ لندن جا کر "پینگوئن" والوں سے بات بھی کر چکے ہیں اور وہی اس کتاب کو شائع کریں گے۔ ڈاکٹر صاحب کا کہنا تھا کہ لندن میں "پینگوئن" والوں کے دفاتر میں سکیورٹی کے ایسے ایسے مراحل سے گزرنا پڑتا ہے کہ شاید راجیو گاندھی اور بے نظیر کے ملنے والوں کو بھی ان سے دوچار نہ ہونا پڑتا ہو۔ اب تک وہ بیس لاکھ پونڈ (کوئی سات کروڑ روپے) تنہا اپنی حفاظت پر خرچ کر چکے ہیں۔ شیطان مرشدی کے بچاؤ کے لئے جو کروڑوں روپے صرف ہو رہے ہیں وہ اس کے علاوہ ہیں اس لئے جو لوگ کہتے ہیں کہ کتاب کے خلاف چلنے والی مہم سے پبلشر اور مصنف کو بڑی آمدنی ہوئی ہے وہ غلطی پر ہیں وہ ان کی سکیورٹی پر خرچ ہونے والے زرِ کثیر کو نگاہ میں نہیں رکھتے۔ میں نے کتاب لکھنے کے ارادے پر ڈاکٹر صاحب کی بڑی حوصلہ افزائی کی کہا کہ یہ ان کیلئے توشۂ آخرت ثابت ہو گی۔ اس سلسلے میں ضروری مواد فراہم کرنے کا میں نے بھی وعدہ کیا

ہے۔ خدا کرے کہ اسے پورا کر سکوں۔

بمبئی بوہرہ کمیونٹی کا مرکز ہے اور قارئین سے بوہرہ جماعت کے قائد سیّدنا برہان الدین اور ان کے مرحوم بھائی ڈاکٹر یوسف نجم الدین سے میرا تعلقِ خاطر پوشیدہ نہیں' سالہا سال سے ان حضرات سے میری نیاز مندانہ رسم وراہ ہے اور یہ لوگ بھی اسے نباہنا خوب جانتے ہیں' ڈاکٹر یوسف نجم الدین کا انتقال ہوا تھا تو میں ان کی فاتحہ کہنے قاہرہ گیا تھا۔ اب کے خیال تھا کہ بمبئی میں ان کے برادر بزرگ سیّدنا برہان الدین کو بھی پُرسا دوں گا مگر افسوس کہ وہ اپنے خاندان کے تمام چھوٹے بڑے افراد کے ساتھ زیارت کے لئے عراق گئے ہوئے تھے صرف ان کے شعبۂ تعلقات عامہ کے غیر بوہرہ سربراہ جناب اقتدار حسین بمبئی میں تھے۔ اقتدار صاحب سیّدنا برہان الدین کے والد ماجد سیّدنا طاہر سیف الدین (سابق چانسلر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی) کے ساتھ علی گڑھ میں کام کرتے تھے جب سیّدنا وہاں سے فارغ ہو کر بمبئی آئے تو اقتدار صاحب کو بھی ساتھ لیتے آئے اب وہ پچیس سال سے بوہرہ جماعت کے ساتھ مل کر کام کر رہے ہیں۔ جب ڈاکٹر یوسف نجم الدین زندہ تھے تو ان کے خاص رفیقِ کار تھے۔ ان کی وفات کے بعد ان کا دل بُجھ گیا ہے دو دفعہ تحریری طور پر سیّدنا برہان الدین صاحب کی خدمت میں اپنا استعفیٰ بھیج چکے ہیں مگر...... واں ایک خامشی تیری سب کے جواب میں...... وہ ایسے جوہرِ قابل کو کیسے رخصت ہونے دیں؟ اقتدار صاحب کو میرے آنے کا پتہ چلا تو وہ ملنے تشریف لائے کہا میں نے ٹیلیکس پر سیّدنا کو آپ کے آنے کی اطلاع دیدی ہے اور وہ فرماتے ہیں کہ اب تو آپ کو بارِ دیگر ان کی دعوت پر بمبئی آنا ہوگا' بتایا کہ انجمن اسلام سے انہوں نے بھی "ڈاکٹر یوسف نجم الدین میموریل لیکچر" شروع کرایا ہے اور اس سلسلے کا پہلا لیکچر پچھلے سال ہو بھی چکا ہے اگر معلوم ہوتا کہ آپ آنے والے ہیں تو "معین الدین حارث میموریل لیکچر" کی جگہ آپ اس لیکچر میں مہمان ہوتے' بہرحال جناب اقتدار حسین سے مل کر بے حد خوشی ہوئی ان ایسے با اخلاق' مستعد' مخلص اور قابل انسان کسی بھی تنظیم اور معاشرے کے لئے حقیقی معنوں میں عظیم سرمایہ ہیں۔

رات کو ہمارے میزبان ڈاکٹر اسحٰق جم خانہ والا کی طرف سے الوداعی عشائیہ تھا' یہاں جناب علی سردار جعفری' حضرت مجروح سلطان پوری اور مشہور صحافی شہریار عابدی کے علاوہ برِّ صغیر پاک وہند کے مشہور اداکار یوسف خان (دلیپ کمار) بھی موجود تھے۔ دلیپ کمار لندن میں مقیم ہمارے ایک پاکستانی دوست سلیم شیخ کے بڑے عزیز دوست ہیں اور ان کے ہاں کئی سال پہلے ان سے میری ملاقاتیں ہو چکی ہیں جن دنوں وہ پاکستان کے دورہ پر تشریف لائے تھے میں ملک سے باہر تھا اس لئے ان سے ملنا نہ ہو سکا۔ اب انہیں یہاں دیکھ کر بڑی خوشی ہوئی۔ خان صاحب عظیم اداکار تو ہیں ہی لیکن انسان بھی بہت پیارے ہیں اتنے خوش گفتار کہ "وہ کہیں اور سنا کرے کوئی" اتنے خوش اطوار کہ جو ملے گرویدہ ہو جائے۔ اپنی اعصاب شکن مصروفیات کے باوجود مطالعہ کے لئے ضرور وقت نکالتے ہیں اور اُردو شعروادب کا بڑا اچھا

ذوق رکھتے ہیں' ان کے بارے میں پاکستانی اخبارات میں یہ پڑھ کر تشویش ہوئی تھی کہ وہ بھارتی دُوردَرشن پر "بائبل" کی سلسلہ وار کہانی میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کا کردار ادا کرنے والے ہیں۔ میں پاکستان میں تھا تو اس سلسلے میں بعض پاکستانی رہنماؤں اور تنظیموں کی طرف سے اس سلسلے میں بیانات بھی نظر سے گزرے تھے مجھے یقین تھا کہ یہ خبر جھوٹی ہوگی کیونکہ مجھے خان صاحب کے عقیدے کی پختگی کا اندازہ تھا مگر پھر بھی میری خواہش تھی کہ اُن سے ملنا ہُوا تو ضرور ان سے بات کروں گا' اس شب مشہور میوزک ڈائریکٹر نوشاد صاحب کے نام پر اور ان کے اعزاز میں کسی میڈیکل ایسوسی ایشن کی طرف سے رفاہی مقاصد کے لئے فنڈ جمع کرنے کی کوئی تقریب تھی' دلیپ کمار اور حضرت مجروح سلطان پوری دونوں اس میں مدعو تھے (مجروح صاحب تو نوشاد سے سمدھی ہونے کا رشتہ بھی رکھتے ہیں) یہ ان دونوں حضرات کی عنایت تھی کہ اس میں حاضری لگوا کر سیدھے اس عشائیہ میں چلے آئے تھے' خان صاحب سے بات ہوئی تو انہوں نے حسبِ توقع شدّومد سے اس افواہ کی تردید کی۔ کہنے لگے "یہ ہوائی اصل میں دیرینہ رنجش کی بناء پر بھارت کے ایک فلمی ماہنامے نے اڑائی ہے ورنہ میں کسی پیغمبرِ خدا کی نقّالی کا سوچ بھی نہیں سکتا جو کچھ اب تک کر چکا ہوں اور کر رہا ہوں اس پر بھی خدا جانے کیا حساب کتاب ہو گا اتنی بڑی گستاخی کی کیسے ہمت کر سکتا ہوں۔ میرے پاس دُوردَرشن کے پروڈیوسر آئے تھے کہ کم سے کم اس کی رسم افتتاح ہی میں شریک ہو جاؤ۔ میں نے کہا "جب میں اسے صحیح ہی نہیں سمجھتا تو اس کی کسی تقریب میں بھی کیسے آسکتا ہوں"۔

اسلام آباد میں ہمارے دوست ایس ایم وارث دلیپ کمار کے دیوانے ہیں آج کل وہ ان پر ایک کتاب مرتب کرنے میں مصروف ہیں۔ ان کا بھی ذکر آیا۔ دلیپ کار ان کے خلوص کے بڑے مدّاح تھے کہنے لگے مہینے میں دوبار تو ضرور فون کرتے ہیں ایسے بے غرض دوست کہاں ملتے ہیں؟ پاکستان میں ان کا جو بے مثال سواگت ہوا تھا اس پر بھی سراپا سپاس تھے مجھ سے بار بار کہا کہ پاکستان جاؤں اور کچھ لکھوں لکھاؤں تو ان کی طرف سے پاکستان کے لوگوں کو ان کی ممنونیت سے لبریز سلامِ محبت ضرور پہنچاؤں۔

لکھنؤ خوابوں کی سرزمین

دہلی سے لکھنؤ روانگی تھی، صبح ساڑھے چار بجے ہوٹل سے ایئرپورٹ کے لئے روانہ ہوئے۔ دہلی سے اندرونِ ملک اور بیرونِ ملک روانگی کے لئے الگ الگ ایئرپورٹ ہیں۔ اب تک ہم نے بین الاقوامی ایئرپورٹ دیکھا تھا۔ اب یہ دوسرا ایئرپورٹ سامنے تھا۔ لاہور کا بادامی باغ یاد آگیا۔ جہاں پانچ پانچ منٹ کے وقفے سے مختلف شہروں کے لئے بسیں چلتی ہیں۔ یہاں بھی ملک کے سارے حصوں کے لئے ہر پانچ منٹ کے بعد ایک طیارہ اُڑ رہا تھا۔ لکھنؤ ہم بوئنگ سے جا رہے تھے مگر اس میں صرف اکانومی کلاس تھی اور سروس بھی پی آئی اے کے مقابلے میں کوئی ایسی اچھی نہیں تھی مگر پچاس منٹ ہی تو تھے اخبارات پڑھتے کٹ گئے۔ یہاں تک کہ ایئرہوسٹس نے لکھنؤ میں آمد کا اعلان کر دیا۔

جب سے ہوش سنبھالا لکھنؤ دل و دماغ میں بسا ہوا ہے۔ اردو زبان کا شاید ہی کوئی طالبعلم ایسا ہوگا جس نے اس شہرِ خوبی کو اپنے خوابوں کی سرزمین نہ سمجھا ہو۔ میں نے تو خیر بُری بھلی اُردو سیکھی ہی انیس اور دبیر کے مرثیوں سے ہے اس لئے اس سرزمین کا بارِ احسان میرے سر ہے۔ وہ لوگ جو دبستانِ دہلی کے خوشہ چیں ہیں وہ بھی لکھنؤ کی زلفِ گرہ گیر کے اسیر ہیں۔ اس علاقے کی ثقافت اور اس کے رہنے والوں کی نفاست آج بھی برِّ صغیر پاک و ہند کے دوسرے خطوں سے جُداگانہ نظر آتی ہے۔ نیچے جھانک کر دیکھا تو ہر طرف سبزہ ہی سبزہ نظر آیا۔ درختوں کے جھنڈ کے جھنڈ گواہی دے رہے تھے کہ زمین بہت زرخیر ہے اور لاریب اس مٹی سے پیدا ہونے والے انسانوں کے قلوب و اذہان بھی اسی طرح سرسبز و شاداب ہوں

گے۔ میرے لکھنؤ پہنچنے کی اطلاع اردو زبان کے مشہور اخبار ''قومی آواز'' میں شائع ہو چکی تھی اس لئے ایئرپورٹ پر کافی تعداد میں احباب استقبال کے لئے جمع تھے۔ ان کی قیادت اردو کے مشہور ادیب اور شاعر جناب ملک زادہ منظور احمد کر رہے تھے جو یہاں کی یونیورسٹی میں شعبۂ اردو کے سربراہ ہیں اور اپنے قدو قامت، رنگت، رفتار و گفتار یہاں تک کہ اپنی وضع قطع میں بھی حضرت شورش کاشمیری مرحوم کا نقشِ ثانی ہیں۔ کئی علمی اور ادبی انجمنوں کے عہدیداروں نے پاکستان کے اس مسافر کو پھولوں سے لاد دیا۔ انڈین کونسل اور کلچرل ریلیشنز کے ڈائریکٹر مسٹر ماتھر بھی موجود تھے جو ہمیں سیدھے وی آئی پی لاؤنج میں لے گئے اور چائے سے ہماری خاطر تواضع کی۔

لکھنؤ کوئی شبہ نہیں کہ بہت پھیل گیا ہے مگر پھر بھی اس میں جدّت و قدامت ساتھ ساتھ چلتے ہیں۔ پرانے شہر سے گزریئے تو کتابوں میں جس لکھنؤ کا نقشہ دیکھ رکھا ہے وہ نگاہوں کے سامنے آجائے گا اور نئے شہر میں آیئے تو گومتی اور درختوں کی کثرت یہاں بھی وہی رنگ دکھاتی جماتی نظر آئے گی۔ لکھنؤ کافی بڑا شہر ہے لیکن لگتا ہے زیادہ سیّاح اس طرف کا رُخ نہیں کرتے یہی وجہ ہے کہ یہاں بڑے ہوٹل نہیں پائے جاتے لے دے کے ''کلارک اودھ'' کے نام سے ایک غنیمت قسم کا ہوٹل ہے جو لکھنؤ میں تو فائیو اسٹار کہلاتا ہے لیکن کسی طور لاہور کے انٹرنیشنل ہوٹل سے بہتر نہیں۔ خوبی یہ ہے کہ دریائے گومتی کے کنارے پر واقع ہے اور اس کے کمروں سے گومتی شہر میں دُور تک بل کھاتی نظر آتی ہے، گومتی کو ہم نے تو دریا پڑھا تھا مگر یہاں کے لوگ اسے ندّی کہتے ہیں۔ یہ شہر کو پانچ مقامات سے کراس کرتی ہے اور اس پر پانچ پُل بنے ہوئے ہیں۔

ہم صبح ہی صبح لکھنؤ پہنچ گئے تھے، پروگرام سب سہ پہر سے شروع ہو رہے تھے۔ دوپہر تک آرام کیا اور پھر لنچ کے لئے ہوٹل کے سَقفی ریستوران پہنچے۔ جہاں سے پورا شہر بھی نظر آتا ہے اور جس کے کھانوں کی بھی اَحباب نے بڑی تعریف کی تھی، لیجیے جناب! وہ پہلا سا لکھنؤ تو اب باقی نہیں کیونکہ ہر مقام کی طرح اس میں بھی تبدیلیاں آچکی ہیں مگر ذرا اس ریستوران کا مینو کارڈ ملاحظہ فرمایئے اور خدا لگتی کہیے کہ یہ لطافت، یہ نفاست اور یہ نزاکت کہیں اور بھی ملتی ہے! میں تو کھانوں کے عنوانات دیکھ کر ہی پھڑک اٹھا۔ سب سے پہلے مینو کارڈ کا نام ہی دیکھ لیجئے ''دسترخوانِ حضرت محل'' حضرت محل، نواب واجد علی شاہ کی بیگم تھیں جنھوں نے انگریزوں سے جنگ کرتے ہوئے خود فوجوں کی کمان کی تھی اس لئے ہماری جنگِ آزادی میں انہیں بلند مقام حاصل ہے۔ (یہ تو بعد میں معلوم ہوا کہ ہوٹل کے سامنے جو ایک بڑا پارک ہے وہ بھی ''حضرت محل پارک'' کہلاتا ہے)

''مشروبات'' کا عنوان ہے ''خوش آمدید'' اور پھر ابتدائی لوازمات جنھیں انگریزی میں ''ایپیٹائزر'' کہا جاتا ہے انہیں ''پیشِ اُلفت'' کہا گیا ہے۔ اب ''سی فوڈ'' کی باری ہے یہ ''نزاکتِ فلک'' ہے۔ اب آگے پڑھتے جایئے اور لطف لیتے جایئے........ ''لکھنوی نعمتیں''........ ''حضور

کیلئے" ...... "نفاست کی انتہا" ...... "دیگ کی مہک" ...... "شریکِ نوالہ" (یعنی تندوری روٹی، نان پراٹھا وغیرہ) ...... "نذرانہ" ...... اور میٹھے کے لئے "الوداع" اور آخر میں قہوہ، چائے، کافی یا کوئی سرد مشروب "آبِ تسکین" ......

لطف کی بات یہ ہے کہ مینو کارڈ انگریزی میں تھا مگر رومن میں لکھے ہوئے یہ عنوانات خالص لکھنوی اُردو میں تھے۔ لکھنؤ کی ثقافت کتنی ہی تبدیل کیوں نہ ہوئی ہو مگر اپنی مبادیات میں اب بھی اس کی وہی آب و تاب جھلکتی نظر آتی ہے۔

سہ پہر میں یوپی اسمبلی کے سپیکر جناب نیاز حسن سے ملاقات تھی۔ نیاز صاحب پاکستان کے ایک مشہور بیوروکریٹ جناب ماجد حسن کے بھائی ہیں، ماجد صاحب حکومت پاکستان کے سیکرٹری رہے ہیں اور اچھے قابل اور دیانت دار افسروں میں ان کا شمار ہوتا ہے۔ نیاز صاحب نستعلیق آدمی ہیں، ستر سے اُوپر عمر ہے، سر پر کانگریسی ٹوپی پہنتے ہیں، کہنے لگے دو دفعہ پاکستان آنا ہُوا۔ دونوں مرتبہ اس ٹوپی کی وجہ سے مسئلہ پیدا ہُوا۔ لاہور میں اس ٹوپی کی وجہ سے کسی نے وی آئی پی لاؤنج میں گھُسنے نہیں دیا اور ایک مرتبہ کراچی جانا ہُوا تو ایئرپورٹ پر یہ ٹوپی دیکھ کر ایک خلقِ خدا پیچھے لگ لی اس سے ٹوپی کے بارے میں میرے اپنے رویے پر بات چل نکلی۔ میں نے کہا "ایک زمانہ میں مَیں قراقلی ٹوپی بڑے شوق سے پہنتا تھا مگر جب سے معلوم ہوا کہ کس طرح بھیڑ کا پیٹ چیر کر نوزائیدہ بچے کی کھال سے اسے بنایا جاتا ہے تب سے طبیعت اس سے وحشت کرنے لگی ہے۔ ویسے بھی گرمیوں میں اسے سر پر نہیں رکھا جاسکتا۔ دماغ کھول اُٹھتا ہے، نماز میں سجدہ کرتے ہوئے اس کے ساتھ الگ دقّت پیش آتی ہے۔ اب تو میں جالی دار دوپلی ٹوپی جیب میں رکھتا ہوں کسی بزرگ کی خدمت میں حاضری ہو یا نماز کا وقت آئے تو اسے پہن لیتا ہوں ورنہ ننگے سر رہنے کی عادت پڑ گئی ہے۔"

اُردو کو اترپردیش (یوپی) میں دوسری سرکاری زبان کا درجہ دیا گیا تو اس پر متعصب ہندو جماعتوں نے بہت شور مچایا، بھارتیہ جنتا پارٹی نے اس میں خاص طور پر سرگرم کردار ادا کیا۔ نیاز صاحب نے بتایا کہ ہماری اسمبلی میں تو بڑی نعرہ بازی بھی ہوئی، مخالفینِ اردو نے "مردہ باد" "زندہ باد" کے نعرے بھی لگائے جب یہ نعرے لگ رہے تھے تو میں نے کہا کہ اردو کے مخالفین یہ سوچ لیں کہ وہ "مردہ باد" اور "زندہ باد" کے جو نعرے لگا رہے ہیں وہ بھی اردو زبان میں ہیں۔ ہم اُردو سے پیچھا چھڑا کر کہاں جائیں گے؟

نیاز صاحب کے بعد یوپی لیجسلیٹو کونسل کے چیئرمین جناب گوپی چند ڈکشٹ سے ملاقات تھی، یہ اترپردیش اپر ہاؤس کے صدرِ مجلس ہیں، انگریز کے زمانے سے ہندوستان کے پانچ صوبوں میں یہ ایوانِ بالا چلے آرہے ہیں، مسٹر ڈکشٹ بزرگ آدمی ہیں اور سانولے رنگ کے دُبلے پتلے ہُو بہُو ہمارے ہاں کے ممتاز سوشلسٹ رہنما جناب شیخ رشید کی طرح، اپنی ابتدائی زندگی میں مزدور تحریک میں حصہ لینے کے واقعات سنائے تو شیخ صاحب اور یاد آئے، کافی پینے کے بعد میں اُٹھنے لگا تو دو عجیب فرمائشیں کیں کہنے لگے "اگر

آپ کو زحمت نہ ہو تو ہمیں حافظ ابراہیم صاحب اور بیگم کلثوم کی تاریخ پیدائش درکار ہے۔ (میں نے سمجھا یہ بیگم کلثوم ہمارے ہاں کی بیگم کلثوم سیف اللہ ہوں گی) ان دونوں نے پنجاب یونیورسٹی سے میٹرک کا امتحان دیا تھا اور یہ دونوں شخصیتیں ہماری کونسل کی ممبر تھیں۔ میرے سیکرٹری سال امتحان اور ولدیت وغیرہ کی ضروری تفصیلات آپ کو فراہم کر دیں گے آپ اگر یونیورسٹی کے ریکارڈ سے ان کی تاریخ پیدائش نکلوا دیں تو ہم اپنے ممبروں کی جو سوانحِ حیات مرتب کر رہے ہیں اس میں ہم اسے استعمال کر سکیں گے۔"

میں جس وقت لکھنؤ پہنچا ہوں وہاں کانگریس کی حکومت تھی اور وزیر اعلیٰ مشہور کانگریسی رہنما این ڈی تیواڑی تھے۔ یہ مرکزی حکومت میں وزیرِ خارجہ کے عہدے پر بھی فائز رہے ہیں۔ اس لیے ان کا نام پاکستان کے اخبار بینوں کے لئے نیا نہ ہو گا۔ مغرب کے بعد لکھنؤ کے شہریوں کی ایک تنظیم ان کی 65ویں سالگرہ کا جشن منا رہی تھی اور اس کے منتظم اعلیٰ یوپی کے ایک مسلمان وزیر ڈاکٹر عمار رضوی تھے۔ ڈاکٹر عمار رضوی اچھے اور پیارے انسانوں کے اس قبیلے سے تعلق رکھتے ہیں جن سے مل کر انسانیت پر اعتماد بڑھتا ہے۔ ہم دونوں کو ایک دوسرے سے غائبانہ تعارف حاصل تھا ان کا اصرار تھا کہ سالگرہ کی یہ تقریب خالصتاً ایک سوشل تقریب ہوگی اس میں مَیں ضرور شرکت کروں، میں ہال میں پہنچا تو دیکھا خوب چہل پہل ہے، بینڈ باجے بج رہے ہیں، گنجائش ایک ہزار نشستوں کی تھی مگر لوگوں کا اژدہام تھا کہ بڑھتا ہی جا رہا تھا۔ یوپی کے گورنر (جو اُردو کے مشہور شاعر بھی ہیں) جناب محمد عثمان عارف صدارت کر رہے تھے اور ان کے ساتھ اسمبلی کے سپیکر، کونسل کے چیئرمین خود چیف منسٹر تیواڑی اور جناب عمار رضوی تشریف فرما تھے۔ ان کے ساتھ کی کرسی میرے لئے خالی رکھی تھی۔ میرے آنے کا اعلان کیا ہُوا سالگرہ کا جشن انڈو پاک جلسے میں تبدیل ہو گیا۔ جو آیا اس نے صدر اور چیف منسٹر کے ساتھ ساتھ پاکستان سے آئے ہوئے مہمان کی حیثیت سے میرا نام بھی ضرور لیا۔ مجھے پیشگی معلوم نہ تھا کہ تقریر مجھے بھی کرنی ہو گی لیکن اب رنگِ محفل دیکھا تو اندازہ ہُوا کہ بچنا محال ہے چنانچہ چیف منسٹر اور گورنر سے پہلے میری تقریر کا اعلان کر دیا گیا۔ میں نے ہندی آمیز اردو میں گفتگو کی میں نے کہا "جب میں اس تقریب میں آ رہا تھا تو سوچا کہ تیواڑی صاحب کو ان کے جنم دن کے موقع پر کیا بھینٹ (تحفہ) دوں" یاد آیا کہ یہ الیکشن کا سمے (وقت) ہے۔ ان کے لئے بٹن زیادہ مناسب ہو گا چنانچہ یہ بٹن لے آیا ہوں جس پر "اللہ" لکھا ہُوا ہے، بٹن کا تعلق گریبان سے ہے اور آپ جانتے ہی ہیں کہ الیکشن میں گریباں سلامت نہیں رہتے۔ مجھے اُمید ہے کہ تیواڑی صاحب یہ بٹن لگائیں گے تو اس کی شوبھا (برکت) سے ان کا گریباں سلامت رہے گا" اس پر ہال میں ہر چہار طرف قہقہے بکھر گئے۔

میں نے کچھ کلمات پاک بھارت تعلقات کے حوالے سے بھی کہے تھے۔ میرے بعد وزیر اعلیٰ تیواڑی اور گورنر عارف نے تقریریں کیں تو انہوں نے میری ہی تقریر کو بنیاد بنا کر بات کو آگے بڑھایا اور اس طرح

یہ تقریب اچھی خاصی سیاسی تقریب بن گئی، ٹی وی، ریڈیو اور پریس نے اسے کوریج دینی ہی تھی میری موجودگی اور صوبائی حکومت کے زعماء کی تقریروں نے اپوزیشن کو بعد میں یہ موقع فراہم کر دیا کہ وہ میرے دورے کو سیاسی رنگ دیکر اعتراضات کا ہدف بنائیں۔ اسی کی صدائے بازگشت پاکستانی پریس میں بھی پہنچی اور اب میں آیا ہوں تو ان سطور کے ذریعے اس کی صفائی دے رہا ہوں۔

تقریب کا ایک دلچسپ پہلو تیواڑی صاحب کا حاضرین و سامعین سے بے تکلف روابط سے تعلق رکھنا تھا، وہ 65 برس کے ہو چکے ہیں کئی سال سے ارباب حل و عقد میں ان کا شمار ہوتا ہے مگر کرّوفر اور شان و شوکت کے مصنوعی طریقے انہیں چھو تک نہیں گئے۔ تقریر کر ہی رہے تھے کہ لوگوں نے شور مچا دیا "تیواڑی صاحب! جیل کا کلام سنایئے" اور وہ سنانے لگے تو پھر شور اٹھا "گا کر، ترنم سے" اور میں نے دیکھا وزیر اعلیٰ صاحب نے نہایت بلند آہنگی کے ساتھ مالکونس میں اپنے شعر سنانے شروع کر دیئے، دو شعر میں نے لکھ لئے تھے قارئین اندازہ لگا سکتے ہیں کہ یوپی کے غیر مسلم بھی اردو شاعری کا کتنا اچھا ذوق رکھتے ہیں، تیواڑی صاحب کے وہ دو شعر یہ ہیں۔

باغ سے صر صر کا جھونکا آشیانہ لے گیا
عندلیبوں کو قفس میں آب و دانہ لے گیا
کون کہتا ہے زبردستی سے ہم پکڑے گئے
ہم کو شوقِ جیل خانہ، جیل خانہ لے گیا

رام لعل بھارت کے مشہور افسانہ نگار ہیں اور میرے آبائی ضلع میانوالی سے تعلق رکھتے ہیں۔ دو چار سال پہلے تشریف لائے تھے تو بطورِ خاص میانوالی گئے۔ اپنے پرانے ہم جماعت دوستوں، پڑوسیوں، استادوں اور احباب سے انہیں ملنے کا بے حد اشتیاق تھا۔ میرے عزیز اور مشہور شاعر ڈاکٹر اجمل نیازی ان کے ہمراہ رہے، واپسی پر ایک بہت خوبصورت سفرنامہ لکھا جو کتابی صورت میں شائع ہو چکا ہے۔ وہ قیامِ پاکستان کے بعد شرنارتھی بنے تو لکھنؤ میں مقیم ہوئے اور آج بھی وہیں ایک کامیاب اور پُرسکون زندگی گزار رہے ہیں۔ قدرتاً مجھے ان سے ملنے کی خواہش تھی اور وہ بھی اپنے ایک ہم وطن کو دیکھنے کے لئے تڑپ رہے تھے۔ میں ہوٹل پہنچا تو پتہ چلا دو دفعہ فون کر چکے ہیں۔ ڈاکٹر ملک زادہ منظور ان کا گھر جانتے تھے انہیں کہا کہ وہ انہیں اطلاع کر دیں میں ان کی خدمت میں خود حاضر ہوں گا۔ وقتِ مقررہ پر ملک زادہ صاحب کی معیت میں ان کے گھر حاضری دی تو وہ اپنے اہلِ خانہ کے ساتھ سراپا انتظار تھے، انواع و اقسام کی مٹھائیاں اور نمکینیات اپنے دسترخوان پر چُن رکھی تھیں۔ دیر تک میانوالی اور اہلِ میانوالی کا ذکر کرتے رہے، زمین کا رشتہ بھی کیا رشتہ ہے، سینکڑوں میل کی دُوری کے باوجود ان کا دل اب بھی اپنے ہم وطنوں کی محبت سے لبریز ہے، بڑی محبت کے آدمی ہیں۔ اصرار کے ساتھ کھانے کی دعوت دی میں نے کہا "کھانا

نہ کہیے، "ڈُنگر" کہیے " (ڈُنگر میانوالی کی زبان میں روٹی اور کھانے کی دعوت کو کہتے ہیں) بے حد خوش ہوئے ویسے بھی گفتگو وہ مجھ سے میانوالی کی پنجابی ہی میں کر رہے تھے' میرا پروگرام اتنا پُر ہجوم تھا کہ اب اس میں کسی کھانے کی گنجائش نہ تھی میں نے کہا لکھنؤ کے سہ روزہ قیام میں کسی بھی وقت بغیر پیشگی نوٹس کے آجاؤں گا مگر افسوس کہ اس کی نوبت نہ آسکی' بہر حال ان کا پُر خلوص تپاک ہمیشہ یاد رہے گا۔

علمی اور دینی حلقوں میں ماہنامہ "الفرقان" لکھنؤ کے مدیر حضرت مولانا محمد منظور نعمانی کسی تعارف کے محتاج نہیں' جماعتِ اسلامی کے بانی اراکین میں شامل تھے مگر بعد میں حضرت مولانا مودودیؒ سے بعض اختلافات کی بنیاد پر جماعت سے الگ ہوگئے۔ اس وقت سے لیکر آج تک تبلیغی جماعت کے ساتھ مل کر دین کی خدمت کر رہے ہیں۔ آج کل صاحبِ فراش ہیں اور ویسے بھی عمر کی اس منزل میں ہیں کہ ان کا ہر لمحہ ملّت اسلامیہ کے لئے نعمتِ غیر مترقبہ ہے۔ میں اب تک ان کی زیارت سے محروم تھا بڑی بدقسمتی ہوتی اگر لکھنؤ آکر بھی ان کی خدمت میں حاضری نہ دیتا۔ ان کے ہاں پیغام بھیجا تو ان کے صاحبزادے مولانا حفیظ نعمانی ازراہِ کرم خود تشریف لے آئے اور مجھے حضرت مولانا کی خدمت میں لے گئے۔ حضرت مولانا کے بڑے صاحبزادے مولانا عتیق الرحمٰن سنبھلی سے تو مجھے نیاز حاصل ہیں وہ عرصہ دراز تک "الفرقان" کے مرتّب رہے ہیں اور ان دنوں لندن میں مقیم ہیں مگر حفیظ صاحب سے اوّلین تعارف تھا اور ان کے اخلاق سے میں بڑا متاثر ہُوا' لکھنؤ کے ایک پرانے محلے کے معمولی سے مکان میں حضرت مولانا نعمانی کا قیام ہے۔ وہیں باہر ایک کمرہ دفتر "الفرقان" کے طور پر استعمال ہوتا ہے۔ ناصاف سی گلی میں بدرَو بہہ رہی ہے اس کی وجہ سے فضا میں بدبُو پھیلی ہوئی تھی۔ ایسے میں عالم اسلام کے اس بطلِ جلیل کی رہائش دیکھ کر دل بھر آیا' حضرت کے کمرے میں داخل ہوئے تو وہ اپنے کسی ارادت مند کے ساتھ چٹائی پر بیٹھے ہوئے تھے۔ ساتھ ہی چارپائی بچھی ہوئی تھی (اور شاید میرے لئے) ایک کرسی بھی رکھی تھی۔ ہمیں دیکھا تو سہارے سے چارپائی پر بیٹھ گئے۔ یہ بھی مہمان کے اکرام کا انداز تھا تاکہ آنے والا انہیں چٹائی پر بیٹھا دیکھ کر وہیں نہ بیٹھ جائے۔ کرسی پر بیٹھے' میں نے بالاصرار چٹائی پر بیٹھنا چاہا مگر ان کا حکم کُرسی پر بیٹھنے کا تھا لاچار تعمیل کرنی پڑی' مولانا کے ہاتھ کانپتے ہیں ثقلِ سماعت کی وجہ سے کانوں میں آلہ لگاتے ہیں' فرمایا عارضہ یہ ہے کہ دماغ کسی وقت کام کرنا نہیں چھوڑتا یہی مرض جواہر لال نہرو کو بھی لاحق تھا اور میرے معالج ہی نے ان کا علاج کیا تھا۔ علاج یہ تھا کہ پنڈت جی سے کہا گیا کہ وہ دو گھوڑے اور ایک بلّی پال لیں کبھی کبھی وہ ان سے کھیلا کرتے اور اس طرح انہیں دوسری سوچوں سے فرصت ملتی' میری مشکل یہ ہے کہ میں یہ بھی نہیں کر سکتا۔ بلّی پالنے سے مجھے کُتّے پالنے کا خیال آگیا۔ میں نے کہا حضرت! شریعت میں اس کی ممانعت کا سبب کیا ہے؟ فرمایا "مجھے معلوم نہیں اور میں تو ویسے بھی بس حکم دیکھتا ہوں اس کی علّت اور حکمت معلوم کرنے کے چکّر میں نہیں پڑتا"۔ مولانا منظور صاحب کی تحریر بہت سادہ اور

سہل ہوتی ہے۔ کچھ گفتگو ان کے طرزِ نگارش پر بھی ہوئی فرمایا "میری بیوی بہشتی زیور تک پڑھی ہوئی تھی میں نے ایک مرتبہ ایک کتاب لکھی وہ انہیں سنائی جو جو لفظ اس کی سمجھ میں نہیں آئے ان پر نشان لگا دیا اور بعد میں ان لفظوں کی جگہ دوسرے آسان لفظ لکھ دیئے"۔ میں نے دیکھا حضرت اپنی بیوی کے ذکر پر آب دیدہ ہوگئے اور بار بار اس کی مغفرت کی دعا کرتے رہے، عمر کے اس حصے میں نیک رفیقہ حیات کتنی بڑی نعمت ہے آپ اس کا عملی اظہار فرما رہے تھے۔

مولانا کی ایک معرکتہ الآراء تالیف "معارف الحدیث" ہے اس کی کئی جلدیں منظرِ عام پر آچکی ہیں جن دنوں مَیں شاہ عالم مارکیٹ لاہور کی جامع مسجد میں خطبۂ جمعہ دیا کرتا تھا اپنے خطبے کی تیاری میں مَیں نے ہمیشہ اس سے بڑا استفادہ کیا۔ میں نے اس کا ذکر کیا تو فرمایا "یہ اللہ کا احسان ہے کہ اس نے مجھ سے یہ کام لے لیا۔ میرا بیٹا دیوبند میں پڑھتا تھا، دورانِ درس تقدیر کی بحث آگئی تو اپنے مدرس سے اس نے اس مسئلہ پر کچھ سوالات کئے، معلم نے کہا چراغ تلے اندھیرا اس کو کہتے ہیں ہم نے تقدیر کا مسئلہ تمہارے باپ کی کتاب "معارف الحدیث" پڑھ کر حل کیا اور تم ہم سے پوچھ رہے ہو فرمایا میرے بیٹے نے آکر مجھ سے ذکر کیا تو میں نے وہ بحث دوبارہ پڑھی۔ واقعی اللہ نے اس سلسلے میں مجھ سے کام لے لیا ہے ورنہ میری کیا حقیقت ہے"۔

چائے آئی، حضرت نے اپنے ہاتھ سے عجوہ (مدینہ کی مشہور کھجور جسے آنحضورؐ بہت پسند فرماتے تھے) نکال کر عنایت فرمائی، چائے بہت لذیذ تھی میں نے کہا "حضرت! ایک بات سمجھ میں نہیں آتی، دینی مدرسوں اور علمائے کرام کے ہاں کی چائے بڑی لذیذ ہوتی ہے، چائے نوشی کا اتنا اچھا ذوق اس طبقے میں کہاں سے آیا"۔ بیماری اور پیرانہ سالی کے باوجود حضرت نے اس بات پر جس بذلہ سنجی اور حاضر جوابی کا مظاہرہ کیا اس پر ملک زادہ منظور، میرے رفیقِ سفر علامہ عباسی اور دوسرے تمام اہلِ محفل واہ واہ کر اٹھے، فرمایا "ان لوگوں میں کوئی اور "نوشی" نہیں ہوتی اس لئے وہ اپنی تمام تر صلاحیتیں "چائے نوشی" پر صرف کر دیتے ہیں"۔

جی تو نہیں چاہتا تھا کہ اس مردِ درویش کی محفل سے اٹھا جائے مگر مجھے آئے ایک گھنٹہ گزر گیا تھا، حضرت کی نقاہت کا خیال بھی دامن گیر تھا اس لئے اجازت چاہی، رخصت ہوتے وقت انہوں نے جس الحاح و زاری سے دُعا کی اس سے ان کی آنکھوں میں تو آنسو تھے ہی ہم سب بھی آبدیدہ ہوگئے۔

ایک شام لکھنؤ کی مشہور ادبی تنظیم "شہرِ ادب" کے زیرِ اہتمام میرے اعزاز میں ایک محفلِ مشاعرہ منعقد ہوئی، ایک زمانہ تھا جب لکھنؤ سے اُردو شاعری کی آبرو قائم تھی، میرو سودا سے لیکر آتش و ناسخ تک اور انشاو مصحفی سے لیکر انیس و دبیر تک کیا کیا قادر الکلام شاعر اس سرزمین نے پیدا نہیں کئے۔ یہاں کا روزمرہ زبان کے لئے سند کا کام دیتا تھا اور یہاں کا محاورہ لسانی نزاعات میں قولِ فیصل کی حیثیت رکھتا تھا۔ ظاہر ہے اب وہ بات تو نہیں ہو سکتی مگر لکھنؤ میں اردو شاعری کا سکہ اب بھی چلتا ہے، دوستوں نے بتایا کہ پچھلے دنوں

جب یہاں فیض کی یاد میں مشاعرہ ہُوا تو وہ کسی ہال کے بجائے "حضرت محل پارک" میں ہُوا اور اس وسیع و عریض پارک کی وسعتیں بھی سامعین و حاضرین پر تنگ ہو گئی تھیں، مشاعرہ میں بھارت کے ممتاز شاعروں کے علاوہ پاکستان کے نامور شعرائے کرام نے بھی شرکت کی اور ہزاروں کے اس اجتماع میں مجال ہے کوئی بد مزگی پیدا ہوئی ہو۔

"سہکار تا بھون" لکھنؤ کا ایک بڑا اور ایئر کنڈیشنڈ ہال ہے، ہمارا مشاعرہ یہاں منعقد ہو رہا تھا۔ اس کی خبریں شائع ہو چکی تھیں اور باقاعدہ دعوتی کارڈ بھی ارسال کیئے گئے تھے۔ اس لئے ہال کھچا کھچ بھرا ہُوا تھا، یوپی حکومت کے صوبائی وزیر برائے ہاؤسنگ خان غفران زاہدی جو خود بھی اچھے شاعر ہیں صدارت کر رہے تھے اور گوپی چند ڈکشت چیئرمین لیجسلیٹو کونسل یوپی کو اس کا افتتاح کرنا تھا۔ ہمارے دوست اور صوبائی وزیر ڈاکٹر عمار رضوی بھی تشریف فرما تھے۔ ناظمِ مشاعرہ جناب پروفیسر ملک زادہ منظور احمد تھے جن کے کمالاتِ نظامت مَیں دہلی کے بین الاقوامی نعتیہ مشاعرہ کے دوران دیکھ چکا تھا۔ سُنا ہے وہ کراچی میں بھی ایک انڈو پاک مشاعرہ کی نظامت کر کے حاضرین سے داد پا چکے ہیں مگر پروفیسر صاحب کو اپنے مقام پر خود بھی پڑھنا تھا اس لئے ان کی جگہ سٹیج سیکرٹری کے فرائض ایک اور نغز گو شاعر جناب انور جلال پوری نے ادا کیئے۔ سب سے پہلے ملک زادہ صاحب نے میرے فن اور شخصیت پر ایک تعارفی تقریر کی اور اس کے بعد ڈاکٹر عمار رضوی اور چیئرمین ڈکشت نے استقبالیہ اور افتتاحیہ کلمات کہے۔ ان کے بعد میری باری تھی میں نے جگرؔ کے اس شعر کو اپنی مختصر سی تقریر کا سرِ عنوان بنایا۔

ان کا جو فرض ہے وہ اہلِ سیاست جانیں
میرا پیغام محبت ہے جہاں تک پہنچے

میں نے کہا شاعر نے اپنے شعر کے پہلے مصرعہ میں فرض (یا کام؟) کہہ کر سیاست دانوں کو ان کے فرضِ منصبی کی یاد دہانی کرائی ہے۔ شاعر نے "شغل" نہیں کہا "فرض" کہا ہے اور فرض ان کا بھی یہی ہے کہ وہ محبت کے پیغامبر بنیں مگر شاعر ادیب اور دانشور تو محبت کے سفیر ہیں اور میں بھی بھارتی عوام کے لئے اہلِ پاکستان کی طرف سے امن اور محبت کا سندیسہ لایا ہوں۔ بعد میں مشاعرہ شروع ہوا اور میں جو مشاعروں میں بہت کم شریک ہوتا ہوں۔ آخری شاعر کی حیثیت سے بُلایا گیا اور ازراہِ مہمان نوازی کتنی ہی غزلیں اور نظمیں مجھ سے سُنی گئیں۔ لکھنؤ کے جن شعراء نے مشاعرے میں کلام سنایا میں سب کے اشعار تو نوٹ نہیں کر سکا مگر جن شاعروں کے کچھ شعر میں رقم کر سکا وہ حوالۂ قرطاس کرتا ہوں۔ قارئین دیکھیں گے کہ کس طرح یہ اشعار غمِ جاناں کی جگہ غمِ دوراں کی عکاسی کرتے ہیں۔

نیرؔ مجیدی نے کہا۔

امن کے پیغمبروں کا رات اک جلسہ ہُوا
صبح ہوتے ہی مری بستی میں قتلِ عام تھا

عارف نجمی فرماتے ہیں۔

دن تو باقی ہے مگر ڈوب گیا ہے سورج
نم دریچوں کے اُجالوں کو سیاہی سے بچا

ایک ہندو شاعر روی سکسینہ کا کہنا تھا۔

شرف یہ صرف مرے دوستوں کو حاصل ہے
مجھے ذلیل کوئی دوسرا نہیں کرتا

حسن کاظمی نے تصنع زدہ ماحول پر چوٹ کی۔

خریدے جا رہے ہیں جھوٹے آنسو
غموں کی بھی تجارت ہو رہی ہے

ملک زادہ جاوید' پروفیسر ملک زادہ منظور احمد کے صاحبزادے ہیں' اچھا شعر کہتے ہیں' انہوں نے اپنے مقطع میں میرؔ و غالبؔ کا تقابل کیا' (لکھنؤ والے یوں بھی غالبؔ سے زیادہ میرؔ کے قائل ہیں) ان کا کہنا تھا۔

پریشاں حال تو غالبؔ بھی کم نہ تھے لیکن
شدید دھوپ کا منظر تو میرؔ کھینچے ہیں

بھارت اور خاص طور پر فیض آباد اور اس کے گردونواح کے پس منظر میں نظر بارہ بنکوی کا یہ شعر بڑا غور طلب تھا۔

زندگی کو یہیں تلاش کریں
اب کہاں جائیں قتل گاہ سے دُور

اختر لکھنوی کراچی سے تشریف لائے تھے' آج کل ریڈیو پاکستان سے وابستہ ہیں' عرصے تک مشرقی پاکستان اور بعد میں بنگلہ دیش میں رہے' بہار کے پاکستانیوں کو موضوع بنا کر انہوں نے بڑی دل گداز شاعری کی ہے اور اس سلسلے میں ان کا ایک مجموعۂ کلام بھی شائع ہو چکا ہے۔ اس مشاعرہ میں ان کی غزل کراچی کے حالات کا نوحہ اور مرثیہ تھی' ایک شعر آپ بھی سُنیے۔

چلو کفن سیئیں اپنا اور اپنے پیاروں کا
گزر بسر کے لئے کوئی مشغلہ تو ہو!

ملک زادہ منظور احمد نے شاید اپنے ملک میں ہونے والے ہندو مسلم فسادات پر یہ شعر کہا ہوگا۔

دیکھو گے تو ہر موڑ پہ مل جائیں گی لاشیں
ڈھونڈو گے تو اس شہر میں قاتل نہ ملے گا

ایک اور استاد شاعر حضرت شارب لکھنوی بھی اپنے حالات سے سخت شاکی تھے۔

کوچے دیکھے ہیں سڑک دیکھی ہے گھر دیکھے ہیں
اب کہاں جائیں کہ سب خون میں تر دیکھے ہیں

لیکن انور جلال پوری کا یہ شعر تو خود اہلِ پاکستان کے منہ پر طمانچے کی حیثیت رکھتا تھا۔

زندگی سہمے مسافر کی طرح لگتی ہے
یہ کراچی میں مہاجر کی طرح لگتی ہے

اپنے ایک گزشتہ کالم میں دہلی میں مشہور ادیب اور افسانہ نگار اور ممبر پارلیمنٹ جناب حیات اللہ انصاری سے اپنی ملاقات کا ذکر کر چکا ہوں۔ انہیں معلوم ہُوا کہ میں لکھنؤ جا رہا ہوں تو انہوں نے اپنی بیگم سلطانہ حیات انصاری کو فون کر دیا کہ میری آمد پر وہ ایک خصوصی تقریب کا اہتمام کریں۔ بیگم صاحبہ انجمن ترقی اُردو لکھنؤ کی صدر ہیں اور اس ناطے اُردو زبان سے تو ان کا شغف ظاہر و باہر ہے ہی۔ خوشی کی بات یہ ہے کہ قرآن حکیم میں تدبّر بھی ان کا خصوصی مضمون ہے۔ ان سے ملاقات کا ذکر تو آگے چل کر بیان کروں گا۔ یہاں یہ سنتے جایئے کہ پچھلے دنوں یوپی میں اردو کو دوسری سرکاری زبان قرار دینے کا جو اعلان ہُوا ہے اس میں ان دونوں میاں بیوی نے بڑی تاریخ ساز جدّوجہد کی ہے۔ بھارتی آئین کے آرٹیکل نمبر 347 میں لکھا ہے کہ اگر کسی ریاست کے باشندوں کی معتدبہ تعداد یہ مطالبہ کرے کہ کسی زبان کو علاقائی زبان بنانے کا سرکاری درجہ دیا جائے تو صدر اس مطالبے کو عملی جامہ پہنانے کے احکام جاری کر سکتا ہے۔ جناب حیات اللہ انصاری ان دنوں روزنامہ "قومی آواز" لکھنؤ کے ایڈیٹر تھے جو پنڈت جواہر لال نہرو نے جاری کیا تھا۔ انہوں نے اُردو کے حق میں ایک دستخطی مہم چلانے کا فیصلہ کیا تاکہ صدر پر یہ ثابت کیا جا سکے کہ یوپی کے باشندوں کی ایک بڑی تعداد اُردو کو دوسری سرکاری زبان بنانے کی حامی ہے۔ اس مقصد کے لئے ایک کمیٹی تشکیل دی گئی جس کے صدر پنڈت کشن پرشاد کول تھے اور اس کے اعزازی سیکرٹری جناب حیات اللہ انصاری اور اعزازی آفس سیکرٹری بیگم سلطانہ حیات انصاری تھیں۔ کمیٹی کا دفتر انصاری صاحب ہی کی قیام گاہ پر کھولا گیا۔ طے پایا کہ کم سے کم بیس لاکھ دستخط حاصل کئے جائیں کیونکہ یہ تعداد ریاست کشمیر کے باشندوں سے ڈھائی گنا ہوگی اور متحدہ آسام کی آبادی کی نصف اور اس تعداد کی طرف سے ہونے والے مطالبہ کو نظرانداز کرنا آسان نہ ہوگا۔ جس زمانے میں یہ مہم شروع کی گئی فرقہ واریت زوروں پر تھی۔ محبانِ اُردو اس مقصد کے لئے باہر نکلتے ڈرتے تھے۔ انہیں معلوم تھا کہ اگر اس سلسلے میں کسی جلسہ کا اعلان ہوا تو ردِعمل کے طور پر فسادات کا ایک نہ ختم ہونے والا سلسلہ شروع ہو جائے گا۔ فنڈ موجود نہ تھا، وسائل مفقود تھے مگر انصاری صاحب کی ہمت قابلِ داد ہے کہ ایسے میں بھی انہوں نے ریاست کے طول و عرض کا دورہ کیا اور وہ دستخطی مہم کے لئے آٹھ مراکز قائم کرانے میں کامیاب ہو گئے، ان مراکز میں دستخط لینے والے کارکنوں کی تعداد پانچ ہزار کے لگ بھگ تھی۔ انصاری صاحب ان دنوں

"قومی آواز" سے بطور مدیر چار سو روپے ماہوار مشاہرہ پا رہے تھے (اور ان کی زیرِ ادارت اخبار اس مہم کی زبردست تائید اور پبلسٹی کر رہا تھا) اخبار کے ایک ڈائریکٹر کو اس پالیسی سے اختلاف تھا چنانچہ اس کے دباؤ پر انتظامیہ نے انصاری صاحب کو نوٹس دیا کہ اخبار کے مالی حالات اس مشاہرہ کے متحمل نہیں ہیں' اس پر انصاری صاحب نے اُردو کے لئے خانگی مالی مشکلات کے باوجود قربانی دینے کا فیصلہ کر لیا اور اخبار کی انتظامیہ کو اطلاع دی کہ وہ ایک روپیہ ماہوار کے علامتی مشاہرے پر قومی آواز کی ادارت جاری رکھیں گے۔ یہ مہم ڈیڑھ سال تک جاری رہی اور آخر کار کمیٹی کو انصاری صاحب اور کارکنوں کی عالی حوصلگی سے دستخطوں کی مطلوبہ تعداد حاصل ہو گئی۔ دستخط کرنے والوں نے اپنے گھر کے نابالغ افراد کی تعداد اور حمایت کا بھی اظہار کیا اور اس طرح کل ٹوٹل 43 لاکھ دستخط بن گئے۔ فارموں کی تعداد اتنی زیادہ تھی کہ اگر انہیں اوپر نیچے رکھا جاتا تو 48 فٹ اونچا ایک مینار تیار ہو جاتا' نہ صرف برِ صغیر پاک و ہند میں بلکہ دنیا کی تاریخ میں اتنے بڑے محضرنامے کی تیاری اپنی مثال آپ ہے۔

محضرنامے کی تکمیل پر جولائی 53ء میں لکھنؤ کے گنگا پرشاد ہال میں ایک کانفرنس منعقد ہوئی جس میں یوپی کے اطراف و اکناف سے اردو کے حامیوں نے شرکت کی۔ فرقہ پرست یہ کیسے برداشت کر سکتے تھے انہوں نے جلسہ گاہ پر ہلہ بول دیا۔ انصاری صاحب پیرانہ سالی کے باوجود مشتعل ہجوم کے سامنے دروازہ پر کھڑے ہو گئے۔ انہیں زدوکوب کیا گیا۔ ان پر چاقو سے حملہ کیا گیا مگر ان کے پائے استقامت میں لغزش نہیں ہوئی۔ فروری 54ء میں خوبصورت ڈبوں میں دستخط شدہ فارموں کو محفوظ کر کے ڈاکٹر ذاکر حسین کی قیادت میں (اس وقت وہ صدر نہیں بنے تھے) ایک وفد نے بھارتی صدر ڈاکٹر راجندر پرشاد سے ملاقات کی۔ وفد میں اردو کے مشہور ادیب قاضی عبدالغفار مرحوم' پروفیسر مسعود حسن رضوی مرحوم' پنڈت کشن پرشاد کول' پنڈت سندر لال' قاضی عادل عباسی مرحوم' انصاری صاحب اور ان کی بیگم شامل تھیں۔ حکومت پر اتمامِ حجت ہو گیا مگر یہ مطالبہ سالوں تک حکمرانوں کی سرد مہری کا شکار رہا۔ آخر کار اب الیکشن سے قریب صوبے کی کانگریسی حکومت نے اسے عملی جامہ پہنانے کا اعلان کیا۔

دیر لگی آنے میں تم کو شکر ہے آخر آئے تو!

بیگم حیات اللہ انصاری بزرگ خاتون ہیں ان کا اصرار تھا کہ ایک ملاقات تو ان سے خصوصی ہو گی جس میں وہ قرآن حکیم کی بعض مشکلات مجھ سے زیرِ بحث لانا چاہتی ہیں اور ایک انجمن ترقیٔ اُردو لکھنؤ کی طرف سے ان کی قیام گاہ پر عشائیہ ہو گا جس میں شعراء' ادباء اور عمائدینِ شہر بھی شریک ہوں گے۔ ان کی مجاہدانہ جدّوجہد کی تفصیلات جان کر میں پہلے ہی سے ان کا معتقد ہو چکا تھا انکار کیسے کرتا؟ چنانچہ پروگرام کے مطابق دو دفعہ حاضری دی۔ پہلی بار حاضر ہوا تو وہ قرآن پاک کے بعض مقامات کے بارے میں مجھ سے تشریح طلب ہوئیں۔ مجھے اعتراف کرنا چاہئے کہ خود ان کا مطالعہ اس سلسلے میں عمیق تھا بتایا کہ وہ روزانہ سالوں سے قرآن پاک کی تلاوت کرتیں اور اس کے معانی و مطالب میں تدبر کی کوشش کرتی ہیں۔ ایک

ماڈرن سیاسی کارکن خاتون کا یہ ذوق شوق دیکھ کر میں بہت متاثر ہوا۔ رات کو انہوں نے کھانے پر کافی اہم لوگوں کو جمع کر رکھا تھا' اس میں صوبائی چیف سیکرٹری مسٹر شرما اور صوبائی سیکرٹری تعلیم مسٹر پی سی شرما بھی شامل تھے۔ مسٹر پی سی شرما کو یہاں کے لوگ پاگل چند شرما کہتے ہیں۔ اس کا سبب اس وقت سمجھ میں آیا جب کھانے کے بعد شعری نشست ہوئی اور مسٹر شرما نے بیسیوں شعر سنا ڈالے۔ وہ لاہور کے رہنے والے ہیں اور جدید و قدیم شاعروں کے لاتعداد اچھے اشعار انہیں اَزبَر ہیں۔ ایک بیوروکریٹ کو اس طرح شعر سناتے دیکھ کر لوگ "پاگل چند" نہ کہیں تو اور کیا کہیں۔

لکھنؤ کی ایک اور شخصیت جس سے ملنے کی تمنا تھی وہ حضرت مولانا عبدالماجد دریا آبادیؒ کے بھتیجے اور داماد حکیم عبدالقوی دریا آبادی تھے' حضرت مولانا عبدالماجدؒ کے مشہور و معروف جریدے "سچ" اور پھر "صدقِ جدید" جاری ہوئے تو حکیم صاحب ان کے مدیر انتظامی تھے۔ ان کی وفات کے بعد کچھ عرصہ "صدقِ جدید" ان کی ادارت میں بھی شائع ہوا مگر یہ جریدہ تو مولانا دریا آبادی کی ذات کی وجہ سے پڑھا جاتا تھا اِن کے بعد اس کی مانگ کہاں ہوتی لاچار بند کرنا پڑا۔ 1953ء سے صدق کا قاری چلا آ رہا تھا اس لئے حکیم صاحب کے نام اور کام سے واقف تھا ورنہ اب تو لکھنؤ میں بھی ان کے جاننے والے خال خال ہی رہ گئے ہیں۔ ملک زادہ صاحب سے ذکر آیا تو کہنے لگے چانس لے لیتے ہیں۔ ممکن ہے اپنے دفتر میں مل جائیں' پہنچے تو اتفاق سے تشریف فرما تھے' ملگجے کپڑوں میں ایک منحنی ساسفید ریش انسان ارد گرد دھول بلکہ تہ در تہ مٹی سے اَٹے ہوئے اخبارات کے انبار میں کسی اور دنیا کی مخلوق لگ رہا تھا۔ میرا نام سُنا تو بڑے تپاک سے ملے۔ معلوم ہوا مطب بھی یہیں کرتے ہیں مگر مریض کوئی دیکھنے میں نہیں آیا۔ ابھی ہم باتیں کر ہی رہے تھے کہ ایک بھولی بھٹکی مریضہ کہیں سے آ گئی حکیم صاحب ہم سے باتیں کرنے میں مگن رہے مجھے ڈر لگا کہیں یہ بھی نہ چلی جائے۔ حکیم صاحب سے اجازت لی اور دل پر ناقدریٔ عالم کا بوجھ لیکر واپس آ گیا۔

یوں پھریں اہلِ کمال آشفتہ حال افسوس ہے
اے کمال افسوس ہے تجھ پر کمال افسوس ہے

ایک دن ہوٹل میں اچانک مجھ سے ملنے برِّصغیر پاک و ہند کے مشہور شاعر جناب جگن ناتھ آزاد تشریف لے آئے' اچانک میں نے اس لئے کہا کہ ان کا قیام جموں میں ہے اور یہاں ان کے ہونے کا سان گمان بھی نہ تھا' وہ حضرت حاجی وارث شاہؒ کے عرس کے موقع پر منعقد ہونے والے مشاعرہ میں شرکت کے لئے تشریف لائے تھے اور اسی شام کسی ضروری کام سے واپس جموں جا رہے تھے' میری موجودگی کا سُنا تو ازراہِ کرم ملنے چلے آئے' آزاد سے رام لعل جی کی طرح میرا رشتہ یہ بھی ہے کہ وہ بھی میرے آبائی ضلع میانوالی میں پیدا ہوئے' ان کے والد ماجد اردو کے مشہور شاعر پنڈت تلوک چند مرحوم عیسیٰ خیل ضلع میانوالی کے ایک سکول میں مدرس تھے' آزاد اب تک اس سرزمین کو نہیں بھولے' ان کی نظموں میں وطن سے جدائی کے کرب نے بڑا سوز و گداز پیدا کر دیا ہے۔

آزاد سے میرا رابطہ بہت پرانا ہے مگر عجیب اتفاق ہے کہ اب تک ان سے ملاقات نہ ہو سکی تھی۔ وہ بارہا پاکستان آئے مگر جب بھی آئے مجھے ملک سے غیر حاضر پایا' سالہا سال کے باہمی غائبانہ تعارف کے بعد اچانک ان سے مل کر بڑی خوشی ہوئی' آزاد ہندوستان میں اردو اور پاک ہند تعلقات کے ضمن میں ایک وقیع اور معتبر نام ہے اور حال اور مستقبل کا کوئی تذکرہ نویس اور مورخ اسے نظر انداز نہیں کر سکتا۔

یوپی کے گورنر جناب عثمان عارف کا ذکر گزر چکا' ان سے تیواڑی جی کی تقریب سالگرہ میں ملاقات ہوئی تھی تو انہوں نے گورنر ہاؤس آنے کی دعوت دی تھی۔ عارف صاحب اردو کے مشہور شاعر حضرت بیدل بیکانیری کے فرزند ہیں جن کا کلام حضرت اصغر گونڈوی کی طرح تصوّف اور معرفت کا آئینہ دار ہے۔ خود عارف صاحب بڑی دل آویز شخصیت رکھتے ہیں۔ چھوٹی سی سفید داڑھی نے ان کے چہرے کی نورانیت میں اضافہ کر دیا ہے۔ حبِّ رسولؐ سے سرشار ہیں اس لئے بڑی اچھی نعت کہتے ہیں۔ ہم گورنر ہاؤس پہنچے تو کافی سے تواضع کرنے کے بعد اپنا مجموعۂ کلام اور نعتوں کا ایک کیسٹ عطا کیا' جہاں دو شاعر جمع ہوں وہاں شعر و شاعری نہ ہو یہ امر محال ہے یہاں بھی یہی ہُوا۔ پہلے گورنر صاحب نے اپنا کلام سنایا اور پھر مجھ سے اشعار کی فرمائش کی۔ تبرکاً گورنر عارف کے تین نعتیہ اشعار درج کرتا ہوں۔

صَلِّ علیٰ زباں سے جو حضرتؐ کا نام لوں
میں دل کی آنکھ ہی سے زیارت کا کام لوں
آنکھوں کے اشک دھوئیں گے دل کے غبار کو
پہلے وضو کروں تو محمدؐ کا نام لوں!
عارف زمانہ جان لے مے کش ہے با ادب
ساقی کے ہاتھ چوم کے کوثر کا جام لوں

اگلے دن یوپی دُوردَرشن (ٹی وی) سے میرے انٹرویو کی ریکارڈنگ تھی' مشہور اخبار "ٹائمز آف انڈیا" لکھنؤ کے ایڈیٹر مسٹر بزولا کو مجھ سے انٹرویو کرنا تھا' میں وقت مقررہ پر سٹیشن پہنچا تو وہ مجھ سے پہلے آ چکے تھے 'ایک چیز جو ہمارے ہاں بھارت کے مقابلے میں خوب تر ہے وہ ٹی وی اور اس کا عملہ ہے' بھارت کا دُوردَرشن اپنے پروگراموں میں بھی ہم سے کہیں پیچھے ہے اور مردانِ کار کے لحاظ سے بھی' ہمارے ڈراموں کی تو یہاں اتنی جے جے کار ہے کہ کچھ مت پوچھئے' بمبئی میں خود ڈاکٹر راہی معصوم رضا نے جو فلموں کی کہانیاں اور دُوردَرشن کے سکرین پلے لکھنے میں جواب نہیں رکھتے مجھ سے پاکستان ٹی وی کے ڈراموں کی بے حد تعریف کی۔ "تپش" کی سیریز کے لئے تو وہ بطورِ خاطر رطب اللّسان تھے' ہمارے ہاں کلر ٹی وی پروگراموں کا آغاز بھی بھارت سے بہت پہلے ہُوا اور میں چونکہ خود پاکستانی ذرائع ابلاغ کا مدار المہام رہ چکا ہُوں اس لئے مجھے اپنے ٹی وی انجینئروں' پروگرام پروڈیوسروں اور فن کاروں کی صلاحیتِ کار سے بھی بخوبی آگاہی ہے۔ میں جانتا ہوں کہ اگر انہیں صحیح ڈائریکشن (سمت سفر) مہیا کر دی جائے اور کچھ

وسائل بھی ان کے پاس ہوں تو وہ دنیا کے کسی بھی ملک کے مقابلے میں بہتر نتائج دکھانے میں کم تر نہیں رہیں گے

آدھے گھنٹے کا یہ انٹرویو برِ صغیر کے علمی 'ادبی' سیاسی اور مذہبی مسائل پر محیط تھا۔ دُوردَرشن والے تواری جی کی تقریب میں میری ہندی میں شُدبُد کا اندازہ لگا چکے تھے اس لئے یہاں بھی ان کی فرمائش پر ہندی آمیز اُردو میں گفتگو کی تھی۔ مجھے لکھنؤ میں یہ زبان بولتے تکلّف تو بہت ہُوا مگر پھر یہ خیال کر کے کہ اردو میں تو ہر زبان کے لفظ آسانی سے سما جاتے ہیں میں اس پر قناعت کر گیا۔

تین بجے سہ پہر لکھنؤ کی اردو اکیڈمی کے زیرِ اہتمام میرے لئے استقبالیہ جلسہ تھا۔ اکیڈمی کے ڈائریکٹر ڈاکٹر محمد یونس نگرامی ندوہ کے فارغ التحصیل ہیں کئی سال سعودی عرب میں رہ چکے ہیں ان کے والد ماجد مولانا محمد اویس نگرامی ندوی برِ صغیر کے ممتاز عالمِ دین تھے اور تفسیر قرآن کی آسان تفہیم میں انہوں نے بڑی خدمات انجام دی ہیں۔ ڈاکٹر صاحب ہوٹل میں دعوت نامہ دینے تشریف لائے تو ان سے مل کر بے حد خوشی ہوئی وہ شُستگی اور شائستگی کا چلتا پھرتا نمونہ ہیں اور انہیں دیکھ کر لکھنؤ کی تہذیبِ گزشتہ کا نقش ذہن میں قائم ہو جاتا ہے۔ روزنامہ مشرق لاہور کے ایڈیٹر اور ہمارے مرحوم دوست جناب مکین احسن کلیم اور پاکستان کسٹم کے ایک دیانت دار اور لائق افسر جناب مبین احسن ان کے قریبی عزیزوں میں شامل ہیں۔ اُردو اکیڈمی کی مطبوعات کا سیٹ عطا کیا تو اس میں ان کی بعض تالیفات بھی نظر پڑیں۔

اُردو اکیڈمی کا دفتر شہر کے اندر واقع ہے اور اچھا خاصا وسیع و عریض ہے کوئی پچاس کے قریب عملہ ہے یہ سب تو اپنی اپنی نشستوں پر کام کرتے رہے البتہ شہر کے تیس چالیس ممتاز ادیب 'مصنف اور شاعر اکیڈمی کے چھوٹے ہال میں میرا انتظار کر رہے تھے۔ ان میں جناب رام لعل بھی تھے اور حکیم عبدالقوی دریابادی بھی 'یہیں' مشہور مصنف علی جواد زیدی سے بھی ملاقات ہوئی اور ڈاکٹر آصفہ زمانی سے بھی' ڈاکٹر صاحبہ ہمارے مہربان مولانا سیّد وصی مظہر ندوی کی بہن ہیں اور طالب آملی کی شاعری پر انہوں نے بڑی اچھی کتاب لکھی ہے۔ ڈاکٹر نگرامی کی خیر مقدمی تقریر کے بعد میں نے مختصر سا خطاب کیا اور پھر محفل سوال و جواب کی مجلس میں تبدیل ہو گئی۔ حاضرین نے پاکستان میں اردو اور یہاں کے جدید شعری اور ادبی رجحانات پر بڑے اچھے سوالات پوچھے' جناب رام لعل نے گلہ کیا کہ پاکستان نے اُردو کو اقوام متحدہ کی بہت سی زبانوں میں سے ایک زبان کا درجہ دلانے کی کوشش نہیں کی اس کوتاہی کا ازالہ ہونا چاہئے میں نے وعدہ کیا کہ پاکستان جا کر ان کی تجویز یہاں کے اہل قلم اور اربابِ حل وعقد تک پہنچا دوں گا۔ لکھنؤ کے ادیبوں کی ایک اور اجتماعی خواہش اخبارات و جرائد اور لٹریچر کے باہمی تبادلے پر پابندیوں کے خاتمے کی تھی۔ میں خود اس کا زبردست حامی ہوں اور سینٹ کی اپنی تقریروں میں بھی اس مسئلے پر اظہارِ خیال کر چکا ہوں کیا ہی اچھا ہو اگر پاکستان کی کوئی ادبی تنظیم اس پر دستخطی مہم شروع کر کے اربابِ اقتدار کو اس غلط پالیسی کی تنسیخ پر آمادہ کرنے کی کوشش کرے۔

یہ ممکن نہ تھا کہ لکھنؤ جا کر میں ندوۃ العلماء میں حاضری نہ دیتا اور عالمِ اسلام کی مایۂ ناز علمی دینی اور

ادبی شخصیت حضرت مولانا سیّد ابوالحسن علی ندوی کی زیارت نہ کرتا' مولانا جنہیں یہاں کے چھوٹے بڑے محبت سے علی میاں کہتے ہیں اپنے خانگی کام سے رائے بریلی گئے ہوئے تھے انہیں لکھنؤ میں آنے کی اطلاع ملی تو ازراہِ شفقت واپس تشریف لے آئے ورنہ میرا ارادہ تھا کہ رائے بریلی جاکر ان کی صحبت سے شاد کام ہوں گا۔ کوئی شبہ نہیں کہ حضرت مولانا اس وقت برِّ صغیر پاک و ہند میں نہیں پوری دنیائے اسلام میں کئی پہلوؤں سے اپنا ثانی نہیں رکھتے' وہ تحریر و انشا اور علم و ادب ہی کے میدان کے شاہ سوار نہیں' عمل اور تقویٰ میں بھی سلفِ صالحین کا نمونہ ہیں۔ جدید و قدیم دونوں نسلوں کو اپنی زبان و قلم سے متاثر کرنے کا زبردست ملکہ اللہ تعالیٰ نے ان کی شخصیت میں رکھا ہے۔ نہ صرف مسلمان بلکہ غیر مسلم بھی ان کی اہلیت' علمیت اور سیرت کے دل و جان سے گرویدہ ہیں۔ وہ عوامی خطیب تو نہیں ہیں مگر اپنی شیریں بیانی اور انسانی نفسیات کے مطابق اپنی علمی گفتگو کی بدولت حاضرین کے دلوں کو اپنی طرف کھینچنے کی بے مثال قدرت رکھتے ہیں۔

پچاس کے عشرے میں لاہور کے سعدی پارک کی جامع مسجد میں ان کا ایک خطبۂ جمعہ آج تک میرے دل پر نقش ہے۔ میں ان دنوں خود لاہور میں خطبۂ جمعہ دیا کرتا تھا مگر حضرت مولانا کے خطاب کا سُن کر میں اس دن اپنی مسجد سے ناغہ کر کے سعدی پارک میں حاضر ہوا۔ مولانا کا سراپا اتنا دل آویز ہے کہ ان کی شانِ محبوبیت سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہا جاتا' صاف ستھرا لباس زیب تن کرتے ہیں۔ سعدی پارک کے قریب ہی لاہور کا سب سے بڑا اور مشہور قبرستان "میانی کا قبرستان" واقع ہے۔ مجھے یاد ہے مولانا نے میانی کے قبرستان کے حوالے سے دنیائے فانی اور اسلام کی تعلیمات جاودانی کا وہ نقشہ کھینچا کہ دل آنکھوں کی راہ سے باہر آیا چاہتا تھا' دوبارہ زیارت ایک حج کے موقع پر جدّہ میں ہوئی جہاں میں وزیر مذہبی امور کی حیثیت سے پاکستانی حج وفد کے سربراہ کے طور پر مقیم تھا انہیں معلوم ہوا تو ادارہ تحقیقات اسلامی' اسلام آباد سے وابستہ کسی علمی کام سے مجھ سے ملنے کے لئے آنا چاہا میں نے گوارا نہ کیا کہ وہ تشریف لائیں میں نے خود ان کی قیام گاہ پر حاضری دی اتنی چھوٹی سی بات کو وہ آج تک نہیں بھولے۔ پاکستان میں ایک مرتبہ ملاقات ہوئی تو بطور خاص اس کا ذکر فرمایا اور اب لکھنؤ خدمتِ عالی میں پہنچا تو پھر حاضرین کے سامنے یہ واقعہ دہرا کر میری عزت افزائی کی' دنیائے عرب میں حضرت مولانا کی جتنی قدر و منزلت ہے وہ شاید ہی کسی اور کے حصے میں آئی ہو۔ عربی زبان کے ماہر اور صاحبِ طرز ادیب ہونے کی وجہ سے عرب ملکوں کے ادبی حلقے انہیں بہت احترام کی نظر سے دیکھتے ہیں اور اس بات پر کم و بیش سب کا اتفاق ہے کہ عربی زبان کے زندہ اہلِ قلم میں انہیں امامت کا مقام حاصل ہے۔ علمائے کرام میں مولانا کو یہ امتیاز بھی حاصل ہے کہ وہ شعر و ادب کا نہایت اعلیٰ ذوق رکھتے ہیں اور اس رشتے سے شعرِ اقبال اور فکرِ اقبال دونوں کے زبردست مدّاح ہیں۔ عربی زبان میں اقبال پر ان کی کتاب "روائع اقبال" نے عرب ملکوں میں اقبال شناسی کی نئی جہتیں کھولی ہیں۔ "نقشِ اقبال" کے نام سے اردو زبان میں بھی اس کا ترجمہ ہو چکا ہے اور اقبالیات کے موضوع پر اردو لٹریچر میں یہ کتاب اپنی مثال آپ ہے۔ شعر و ادب' دین و دانش کے علاوہ مولانا تصوّف کی

فیوض و برکات سے بھی مالامال ہیں۔ تاریخ "دعوت و عزیمت" کے نام سے (اب تک شائع ہونے والی) پانچ جلدوں میں انہوں نے صوفیائے عظام اور اولیائے کرام کی پاکیزہ زندگی، ان کی تعلیمات اور عظیم جدوجہد پر جولاجواب تذکرہ قلم بند کیا ہے ہمارے پورے دینی لٹریچر میں اس کی نظیر نہیں ملتی۔ مولانا جماعت اسلامی کے بانی اراکین میں شامل تھے لیکن بعد میں حضرت مولانا مودودیؒ سے بعض اختلافات کی بناء پر جماعت سے مستعفی ہوگئے، اس کے بعد سے تبلیغی جماعت کا ساتھ دیتے ہیں مگر تبلیغی جماعت کے اکابرین سے اس معاملے میں پھر جداگانہ انداز رکھتے ہیں کہ عملی سیاست سے الگ تھلگ ہونے کے باوجود ملّت کے اجتماعی مسائل کی عقدہ کشائی کے لئے ہمیشہ سینہ سپر رہتے ہیں۔ گزشتہ دنوں بھارت میں مسلم پرسنل لاء کو خطرات لاحق ہوئے تو آپ کی سربراہی میں ہندوستان کے علماء اور مسلم تنظیموں نے بڑی کامیاب جدوجہد کی ہندو مسلم فسادات کی آگ بجھانے کے لئے آپ ہمیشہ پیش پیش رہے ہیں فساد زدہ علاقوں کا دورہ کرکے ہندو مسلم مشترک اجتماعات سے آپ کے خطابات نے ہمیشہ اس سلسلے میں بڑے اثرانگیز نتائج پیدا کیے ہیں۔

حضرت مولانا علی میاں صدر جنرل محمد ضیاء الحق مرحوم کے دَورِ حکومت میں کئی بار پاکستان تشریف لاچکے ہیں۔ مرحوم کو ان سے بڑی عقیدت تھی پہلی مرتبہ کسی نجی سفر پر مولانا کی آمد کی خبر سنی تو خصوصی طیارے سے خود کراچی پہنچے اور ان کی خدمت میں حاضری دی۔ حضرت مولانا بھی ان کی دل سے قدر کرتے تھے اور ان کے لئے ہمیشہ کلمۂ خیر کہتے تھے۔ صدر صاحب کے عہدِ حکومت کے بارے میں ان کے بعض ارشادات سے ہم ایسے نیازمندوں کو اختلاف بھی تھا لیکن ہمیں معلوم تھا کہ مولانا کے یہ خیالات کسی مفاد یا تملّق کے بجائے سراسر خلوصِ نیّت پر مبنی ہیں۔ جنرل ضیاء الحق مرحوم کی وفات پر انہوں نے جو دل گداز مضمون لکھا ہے وہ بھی ان کے انہی محبت بھرے احساسات کا آئینہ دار ہے۔

ندوۃ العلماء کا دارالعلوم ایک زمانے میں شہر سے باہر تھا مگر اب لکھنؤ کی آبادی پھیل جانے کی وجہ سے شہر کی وسعتوں میں سمٹ آیا ہے پھر بھی اس کے اندر جاکر احساس ہوا جیسے کسی نئی بستی میں نکل آئے ہیں۔ درس و تدریس کے کمروں، دارالاقامہ (ہوسٹل) کی تعمیرات، لائبریری، خوبصورت مسجد، ادارۂ نشریاتِ اسلام کے دفاتر، اساتذہ کی قیام گاہوں اور مہمان خانے کی توسیع پر مشتمل کئی ایکڑ میں پھیلا ہوا یہ خوبصورت شہر فکر ہی کو غذا فراہم نہیں کرتا نظر کو بھی جلا بخشتا ہے۔ عصر کی نماز ہو رہی تھی، مولانا مسجد تشریف لے جاچکے تھے میں بھی نماز کی ادائیگی کے لئے مسجد میں صفِ آخر میں کھڑا ہوگیا۔ مسجد کا ہال بہت بڑا تھا لیکن پورا ہال نمازیوں سے بھر چکا تھا۔ ظاہر ہے یہ سب دارالعلوم کے طلبہ و اساتذہ تھے، صاف ستھرے کپڑے پہنے اُجلی اُجلی سفید دوپلی ٹوپیوں میں ملبوس یہ کسی آسمانی مخلوق کا اجتماع لگ رہا تھا، ڈاکٹر یونس نگرامی میرے ساتھ تھے، نماز کے بعد ہم مہمان خانے کے باہر رکھی ہوئی کرسیوں پر آکر بیٹھ گئے۔

مولانا کا قیام بھی یہیں رہتا ہے۔ تھوڑی دیر میں مولانا بھی تشریف لے آئے وہی نورانی سراپا، اچکن اور پاجامے میں ملبوس، ایسے لگا جیسے ذوقِ نفاست انسانی تجسیم میں ہماری نگاہوں کے سامنے ہے۔ معانقے کے بعد بار بار فرمایا "آپ مہمان تھے آپ کی خدمت میں آنا تو مجھے چاہئے تھا" پھر پہلی دو ملاقاتوں کا تذکرہ فرمایا، طبیعت علیل تھی مگر اس کے باوجود کسی اور کو ہمارے ساتھ بھیجنے کے بجائے دارالعلوم دکھانے کے لئے ہمیں خود ساتھ لے چلے، گاڑی جہاں جہاں سے گزرتی تھی وہاں کی تاریخی اہمیت بتاتے جاتے۔ ندوہ کا فراخ ہال بطور خاص دکھایا فرمایا "یہاں علامہ رشید رضا مصری نے بڑا فاضلانہ خطاب فرمایا تھا، مولانا شبلی نعمانی چاہتے تھے کہ اس تقریر کی اردو میں بھی ترجمانی ہو، مولانا ابوالکلام آزاد کی عمر اس وقت بیس سال کی ہوگی وہ ترجمہ کرنے کھڑے ہوئے تو ان کے ترجمہ کی اثر آفرینی میں لوگ ایسے کھوئے کہ اصل تقریر کا تاثر ہی بھول گئے"۔ ہال میں آویزاں چارٹ خاص طور پر دامنِ دل کو کھینچ رہے تھے ان کے ذریعے مختلف علوم و فنون میں ہندوستانی علماء کا مقام واضح کیا گیا تھا۔ علمِ فقہ میں حضرت مولانا محمد رضا خان بریلویؒ اور علمِ تفسیر میں حضرت مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ اور استاد محترم مولانا امین احسن اصلاحی کے نام دیکھ کر بڑی مسرت ہوئی ورنہ فرقہ واریت اور تحزب کے اس دَور میں اپنے حلقے سے باہر کون کسی کا اعتراف کرتا ہے۔

ندوہ کی لائبریری بھی قابلِ دید ہے اس میں ایک لاکھ سے زیادہ کتابیں ہیں۔ پانچ ہزار تو مخطوطات ہی ہوں گے۔ مولانا ایک ایک الماری کے قریب جا کر اور خاص خاص قلمی نسخے دکھا کر کتابوں کی اہمیت پر روشنی ڈال رہے تھے اس بات کا انہیں قلق تھا کہ پاکستان میں چھپنے والی بہت کم کتابیں یہاں موجود ہیں فرمایا کہ پنجاب یونیورسٹی کے دائرہ معارفِ اسلامی کی چند ابتدائی جلدیں میں پاکستان سے ہمراہ لایا تھا مگر بعد میں چھپنے والی جلدوں سے ہماری لائبریری محروم ہے۔

ہال اور لائبریری دونوں جگہ سیڑھیاں چڑھ کر اوپر جانا پڑتا ہے۔ مولانا کی صحت اچھی نہیں، نظر بھی کمزور ہے مگر مہمان کے اکرام میں انہوں نے یہ صعوبت بھی برداشت کی لائبریری پہنچے تو لائبریرین نے بتایا کہ مولانا یہاں بہت لمبے عرصے کے بعد تشریف لائے ہیں۔

ادارہ نشریاتِ اسلام مولانا کی اردو اور عربی مطبوعات چھاپنے کا اہتمام کرتا ہے۔ اس کے دفتر میں چائے کا انتظام تھا۔ پچھلے دنوں مولانا کے قلم سے سیدنا علی مرتضیٰؓ کی سوانح پر بڑی معرکۃُ الآرا کتاب نکلی ہے۔ اردو اور عربی دونوں زبانوں میں اس کے ایڈیشن شائع ہوئے ہیں میں ماہنامہ "معارف" اعظم گڑھ میں اس پر ایک تفصیلی تبصرہ پڑھ چکا تھا جی میں تھا کہ اس کتاب کا مولانا سے تقاضا کروں گا۔ یہ ان کا تصرفِ روحانی تھا کہ ادارہ کے کارپردازوں کو انہوں نے کتابوں کا جو پیکٹ میرے لئے تیار کرنے کا پیشگی حکم دے رکھا تھا اس میں "المرتضیٰ" کے اردو اور عربی دونوں ہی ایڈیشن شامل تھے۔

چائے کے بعد میں نے اجازت لی تو فرمایا چند منٹ کے لئے مہمان خانہ چلیں وہاں کچھ اور احباب بھی

آپ سے ملنے کے متمنی ہیں، میں نے عرض کیا "مجھے تو آپ کی مصروفیات کا پاس ہے ورنہ آپ کی صحبت سے فیض یاب ہونے کے یہ مواقع کہاں ملتے ہیں" میں نے شعر پڑھا۔

ٹھہر بھی جا درِ ساقی پہ دو گھڑی کے لئے
تمام عمر پڑی ہے روا روی کے لئے

فرمایا مصحفی نے بھی کہا ہے

ٹھہر بھی جا جرسِ غنچہ کی صدا پہ نسیم
کہیں تو قافلۂ نو بہار ٹھہرے گا

مہمان خانے کے باہر کرسیوں پر چند منٹ نشست رہی میں نے اپنی کتاب "جنھیں میں نے دیکھا" کا نسخہ پیش کیا اس میں ناموں کی فہرست پر نظر ڈالی 'ایک ایک نام پڑھا فرمایا "اس میں تو کئی مشترکہ نام شامل ہیں" پھر اپنے خادم خاص کو حکم دیا "یہ کتاب میرے کمرے کی کھڑکی پر رکھ دو میں آج رات ہی اس کا مطالعہ کروں گا" رخصت ہوا تو عطر کی تین شیشیاں عطا فرمائیں اور میں حسرت بھری نظروں سے مولانا کے وجود باجود اور دار العلوم کی مقدس فضا کو دیکھتا ہوا گاڑی میں بیٹھ گیا'

آج جی بھر کے اسے دیکھ لے کوثر سرِ بام
جانے ان گلیوں میں پھر کب تیرا پھیرا ہو گا

ایک استقبالیہ اُتر پردیش ہندو اردو ساہیتہ ایوارڈ کمیٹی نے بھی ترتیب دیا۔ ممبر پارلیمنٹ بیگم حامدہ حبیب اللہ صدارت کر رہی تھیں۔ یہاں بھی ادیبوں اور شاعروں کا اچھا خاصا اجتماع تھا۔ سب سے پہلے جناب حسن کاظمی نے میری گل پوشی کی اور اس کے بعد کمیٹی کے سیکرٹری جنرل جناب اطہر نبی ایڈووکیٹ نے سپاسنامہ پیش کیا ان کا کہنا تھا کہ آزادی کے بعد بدقسمتی سے اردو زبان بھی فرقہ پرستوں کے عتاب کا نشانہ بن گئی تھی لیکن رفتہ رفتہ ماحول پُر سکون ہو رہا ہے اور اردو کے لئے بھی فضا سازگار ہونے لگی ہے۔ انہوں نے اس پر خوشی کا اظہار کیا کہ چار دہائیوں کے بعد ہی سہی لیکن آخر کار اردو کو سرکار نے اُتر پردیش میں دوسری سرکاری زبان کی حیثیت سے تسلیم کر ہی لیا ہے۔ مسٹر اطہر نبی نے بتایا کہ ان کی تنظیم فروری میں اردو کے مشہور شاعر جناب فراق گورکھپوری کے فکر و فن پر ایک بین الاقوامی فیسٹیول منعقد کر رہی ہے جس میں پاکستان سے بھی ممتاز اہلِ قلم کو شرکت کی دعوت دی جا رہی ہے۔ انہوں نے اُمید ظاہر کی کہ میں بھی مہمانِ خصوصی کے طور پر ان تقریبات میں شرکت کروں گا۔ مشہور افسانہ نگار جناب رام لعل ازراہِ کرم یہاں بھی تشریف لائے تھے اس موقع پر انہوں نے بھی مختصر خطاب کیا اور میری آمد کو پاک بھارت کے علمی ادبی حلقوں کے مستقبل کے روابط کے لئے نیک فال قرار دیا۔ انہوں نے یہاں اپنی وہ تجویز پھر دہرائی کہ پاکستان اردو کو یو این تک لے جانے کی کوشش کرے ہم سب اس سلسلے میں آپ لوگوں کا ساتھ دیں گے۔

میں نے اپنی تقریر میں فراق گورکھپوری کی شاعرانہ عظمت پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے کہا کہ فراق

پاک بھارت اُردو نواز حلقوں میں وصّال کی حیثیت رکھتے ہیں اور میں کوشش کروں گا کہ آپ کی کانفرنس میں ضرور شرکت کروں۔

چائے سے پہلے جناب خورشید افسر بسوانی نے کمیٹی کی طرف سے مجھے لکھنؤ کی شناخت کا کرتہ اور ٹوپی کا تحفہ پیش کیا۔ واضح رہے کہ لکھنؤ میں چکن کاری کی صنعت محنت کش گھرانوں کی معاش کا بہت بڑا سہارا ہے اب بھی تقریباً تیس ہزار مسلمان خواتین چکن کی کڑھائی کے کارخانوں میں کام کرتی اور اپنے گھر والوں کی قوتِ لایموت کا سامان فراہم کرتی ہیں۔

لکھنؤ میں مشہور افسانہ نگار رام لعل کے ہاں

بمبئی۔ انجمن اسلام کے جلسہ میں لوگ مصنف کی تقریر سننے کے لئے جمع ہو رہے ہیں۔

دیوہ شریف میں حاضری

میں جن دنوں لکھنؤ پہنچا ہوں برِّ صغیر کے مشہور صوفی اور بزرگ حضرت حاجی وارث علی شاہ رحمتہ اللہ علیہ کا عرس ہو رہا تھا' حضرت کی جائے پیدائش جہاں اب ان کا مزارِ پُرانوار بھی ہے دیوہ شریف ضلع بارہ بنکی میں واقع ہے، جو لکھنؤ سے کار کے ذریعے گھنٹہ سوا گھنٹہ کی مسافت ہے' سلسلہ وارثیہ کے بہت سے متوسّلین میرے حلقۂ احباب میں شامل ہیں کچھ ان کے حوالے سے اور کچھ حضرت حاجی صاحبؒ کے ملفوظات و واقعاتِ حیات سے تصوّف کے اس عظیم سلسلے سے عرصۂ دراز سے عقیدت رکھتا ہوں' پہلے سے پروگرام بنا کے چلا تھا کہ اس خاک کو بھی بوسہ دوں گا جہاں رُشد و ہدایت اور عشق و محبت کی یہ شمعِ فروزاں ہے اب آ کے پتہ چلا کہ ان دنوں سالانہ عرس کی تقریبات بھی منعقد ہو رہی ہیں تو اس موقع کو غنیمت جانا اور اپنے دوست اور یوپی حکومت کے صوبائی وزیر ڈاکٹر عمار رضوی کی معیت میں دیوہ شریف کا قصد کر لیا۔

ہندوستان کے سلسلۂ اولیاء میں یوں تو کتنے ہی بزرگ حاجی گزرے ہیں مگر تصوّف اور ولائت کی دنیا میں جب کسی کے لئے تنہا "حاجی صاحب" کے الفاظ استعمال کئے جاتے ہیں تو ان سے مراد حضرت حاجی امداد اللہ مکیؒ یا حضرت حاجی وارث علی شاہؒ ہوتے ہیں۔ آپ 1822ء میں دیوہ شریف ضلع بارہ بنکی یوپی میں پیدا ہوئے۔ ابھی عہدِ طفولیت تھا کہ یکے بعد دیگرے آپ کے والد اور والدہ جنت کو سدھارے۔ دادی جان نے آپ کو آغوشِ تربیت میں لیا ابھی سات سال کے تھے کہ دادی بھی اللہ کو پیاری ہوئیں۔ اب بڑی بہن اور بہنوئی کی باری تھی۔ انہوں نے اس دُرِ یتیم کو سینے سے لگایا' آپ کے بہنوئی حضرت حاجی

خادم علی شاہؒ وقت کے پہنچے ہوئے بزرگ اور حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ کے شاگردِ رشید تھے' انہوں نے دینی تعلیم کے لئے آپ کو فرنگی محل میں داخل کرادیا' قرآنِ پاک تو آپ سات سال کی عمر ہی میں حفظ کر چکے تھے اب دینی علوم کی تحصیل شروع کی مگر ایسے میں آپ اکثر جنگل کی راہ لیتے اور ویرانوں میں جاکر یادِ خدا میں غرق ہوجاتے' پیار سے آپ کو سب لوگ "مٹھن میاں" کہتے تھے ان کا خیال تھا کہ "مٹھن میاں" خدانخواستہ کسی دماغی عارضے کا شکار ہیں مگر حضرت حاجی خادم علی شاہؒ جو خود ایک ولیٔ کامل تھے جانتے تھے کہ یہ بچہ آگے چل کر کس طرح تصوّف وطریقت کے آسمان پر آفتاب وماہتاب بن کر چمکنے والا ہے' انہوں نے آپ کو باقاعدہ بیعت کرکے قادریہ سلسلہ میں داخل کرلیا اور گیارہ سال کی عمر میں آپ کو خلافت عطا کردی حضرت شاہ صاحب کا کچھ ہی عرصہ بعد ستّر سال کی عمر میں انتقال ہوگیا تو آپ کے تمام ارادت مندوں نے بالاتفاق نوعمر وارث کو آپ کا جانشین منتخب کرلیا۔ اس وقت آپ کی عمر تیرہ سال کی تھی' دستارِ خلافت سر پر بندھوا کر چلے تو ایک ساتھی نے کباب کھلانے کی فرمائش کی' آپ کی جیب میں کچھ نہ تھا' کبابیے نے پیسے مانگے تو اس کے عوض وہی دستار اس کے حوالے کردی اس طرح مشائخ عظّام اور پیرانِ کرام کے رسم ورواج کے پہلے دن ہی سے تارک ہوگئے۔ یہی وجہ ہے کہ اپنی وفات کے وقت آپ نے یہی وصیت کی کہ اس خانقاہ میں کوئی سجادہ نشین نہیں ہوگا' کاغذ قلم دوات منگوا کر دمِ وصال آپ نے باقاعدہ تحریر لکھائی کہ

"ہماری منزل عشق ہے اور عشق میں جانشینی کا کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا"

غالباً برِصغیر کے سلسلہ ہائے تصوّف میں یہ پہلا سلسلہ ہے جس میں نسبی اور نسلی سجادہ نشینی کا کوئی تصور نہیں پایا جاتا

پندرہ سال کی عمر میں آپ نے اپنی تمام جائیداد رشتہ داروں میں تقسیم کردی' گھر کا سامان غریبوں میں بانٹ دیا اور خود تن تنہا حج کے لئے نکل کھڑے ہوئے' اس دوران آپ کی شہرت دُور دُور تک پھیل چکی تھی۔ اثنائے سفر میں جہاں جہاں سے گزر ہُوا' عقیدت مندوں کے ٹھٹھ لگ گئے آپ بھی جگہ جگہ مختصرسا قیام کرتے لوگوں کو اپنے حلقۂ بیعت میں داخل کرتے منزلیں مارتے چلے گئے' اٹاوہ سے گزر ہُوا تو حضرت بیدم شاہ وارثیؒ کو مرید بنایا جن کی صوفیانہ شاعری آج بھی حضرت امیر خسروؒ کی طرح ہر محفلِ سماع کی جان ہے' بیدم عشقِ مجازی میں مبتلا تھے' مرشدِ کامل کی نظر نے عشقِ مجازی کو عشقِ حقیقی میں تبدیل کردیا' اٹاوہ سے دیوہ شریف جا بسے اور یہیں اپنے مرشد کے قدموں میں زندگی گزار دی۔ اس سفر میں آپ اجمیر میں حضرت خواجہ غریب نوازؒ کی بارگاہ میں پہنچے اور یہاں ایک دفعہ جو جوتے اتارے تو پھر ساری زندگی جوتے نہیں پہنے' اجمیر سے جے پور ہوتے ہوئے آپ بمبئی پہنچے اور یہاں سے بحری جہاز کے ذریعے عازمِ حجاز ہوئے اور یہ پہلا حج آپ نے 1836ء میں ادا کیا۔

مدینہ منوّرہ سے آپ 1838ء میں پاپیادہ نجفِ اشرف روانہ ہوئے یہاں تین ہفتے قیام کیا اور ننگے

سر، ننگے پاؤں کربلائے معلیٰ پہنچے، یہاں کی حاضری کا یہ اثر ہوا کہ آپ نے اس کے بعد پوری زندگی چارپائی، کرسی، مسہری، تخت، چوکی وغیرہ پر بیٹھنا اور لیٹنا چھوڑ دیا، زندگی بھر ہمیشہ آپ زمین پر بیٹھے اور اسی کو اوڑھنا بچھونا بنایا، شہدائے کربلا کی بھوک پیاس کی وجہ سے لذائذِ دنیا ترک کر دیئے ہمیشہ روزے سے رہے، ایک چھٹانک سے زیادہ کبھی غذا نہیں کھائی، آخری ایام میں تو اس کی مقدار ایک تولہ کر دی، زبان ذائقے کا امتیاز کھو بیٹھی تھی ایسا بھی ہوا کہ مریدوں نے دودھ چاول پیش کئے اور آپ نے انہیں چکھنے کے بعد فرمایا "دال بہت اچھی بنی ہے" کربلائے معلیٰ کے بعد پیدل ہی مشہدِ مقدس پہنچے اور پھر بغداد میں حضرت غوث الاعظم شیخ عبدالقادر جیلانی رحمتہ اللہ علیہ کے مزارِ پُرانوار پر حاضری دی، کہتے ہیں کہ آپ کی آمد سے پہلے درگاہِ جیلان کے سجادہ نشین کو القا ہوا کہ ہندوستان سے ایک حسنی حسینی سید آرہا ہے جس کا نام وارث علی ہے وہ یہاں پہنچے تو اسے ہماری طرف سے زرد رنگ کی دو چادریں پیش کی جائیں، یہ چادریں آپ نے کیا پہنیں کہ اس کے بعد ساری زندگی آپ "احرام پوش" بن کر رہ گئے اور یہ چادریں سلسلۂ وارثیہ کے فقیروں کی خاص پہچان ٹھہریں، یہاں تک کہ انہی چادروں کا انہیں کفن دیا جاتا ہے، فقر کا منتہا اپنے آپ کو مٹا کر خاک ہو جانا ہے اور خاک کا رنگ زردی مائل ہوتا ہے۔ اس لئے علی مرتضیٰ کی شان بوترابی سے نسبت رکھنے والے فقیر اسی رنگ کو پسند کرتے ہیں، سنن ابو داؤد میں ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السّلام دوبارہ نزول فرمائیں گے تو وہ بھی دو زرد چادریں پہنے ہوں گے۔

دنیائے عرب کے اس سفر میں آپ بار بار مکّہ اور مدینہ آتے جاتے رہے چنانچہ چار بار حج سے سرفراز ہو کر 1841ء میں واپس تشریف لائے، واپسی پر عزیزوں نے شادی کے لئے اصرار شروع کر دیا، آپ انہیں ٹالنے کے لئے اسی سال دوبارہ حج کے لئے نکل کھڑے ہوئے اور اب کے جہاز کے بجائے پیدل ہی عشق کی یہ منزل طے کی ؎

منزلِ عشق پہ تنہا پہنچے، کوئی تمنا ساتھ نہ تھی
تھک تھک کر اس راہ میں آخر، اِک اِک ساتھی چھوٹ گیا

حج کے بعد ترکی کا سفر اختیار کیا، یہاں سلطانِ ترکی سلطان عبدالمجید خان نے آپ کی بیعت کی، پورے ملک میں آپ کی خدا رسیدگی کا ڈنکا بجنے لگا آپ نے یہ دیکھا تو پھر حج کا ارادہ کر لیا اور حج ادا کر کے 1844ء میں واپس دیوہ شریف تشریف لے آئے، یہاں پہنچ کر کچھ ہی دن گزرے تھے کہ حرمین شریفین کی یاد پھر تڑپانے لگی اور آپ ایک دفعہ پھر پیدل حج کے لئے روانہ ہو گئے، حج کے بعد آپ ایران آئے وہاں سے روس گئے، جرمنی پہنچے، مصر کی سیاحت کی، بیت المقدس میں حاضری دی اور یہاں سے پھر حج کے لئے جہاز روانہ ہو گئے، ادائے حج کے بعد عدن اور یمن تشریف لے گئے اور وہاں سے رمضان میں دوبارہ مکّہ مکرمہ پہنچ گئے حج تک یہیں رہے محرم میں مدینہ منورہ حاضری دی اور دو ہفتے تک روضۂ اقدس کی مجاوری کرنے کے بعد اجمیر شریف سے ہوتے ہوئے 1850ء میں دیوہ شریف نزول فرما ہوئے۔

آپ کی کرامتیں لاتعداد ہیں' لاکھوں آدمیوں نے آپ کے دستِ حق پرست پر بیعت کر کے توبہ کی' ہزاروں غیر مسلموں نے اسلام قبول کیا اور آج بھی عالم یہ ہے کہ مسلم اور غیر مسلم بلا امتیاز آپ کی زلفِ محبت کے اسیر ہیں۔ آپ نے طالبانِ حق کو فقیری کا جو راستہ دکھایا اس کا خلاصہ تین لفظوں میں سمیٹا جائے تو اس کا عنوان محبت' غیرت اور فنائیت...... بنیں گے' خدا سے محبت' بندگانِ خدا سے محبت' بلا امتیاز مذہب و مسلک سے محبت آپ کی تعلیمات کا نچوڑ ہے۔ آپ کا فرمان تھا جس سے ملو یہ خیال کرو کہ یہ مجھ سے بہتر ہے' کسی سے سوال نہ کرو' اللہ پر توکل رکھو' تعویذ گنڈا تک نہ کرو کہ عاشقوں کی دُعا مدعا سے بے نیاز ہوتی ہے اُس سے سوائے اُس کے کچھ نہ مانگو' درود شریف پڑھو تو اللہ کے لئے پڑھو طلبِ دنیا کے لئے نہیں پڑھو' قرآن پاک کی تلاوت کو حرزِ جاں بناؤ' میلاد شریف کی نورانی محفلوں میں شرکت کرو' محبوب کی شکایت نہ کرو کہ یہ مذہبِ عاشقی میں کُفر کا درجہ رکھتی ہے' ہر حال میں خوش رہو' تکلیف و راحت سب خدا کی طرف سے ہے پھر شکایت کیسی؟ عشق کی تشریح آپ کے ملفوظات میں یہ کی گئی ہے کہ اس کا "ع" ...... عبادت الٰہی ہے "ش" ...... شریعت کی پابندی ہے اور "ق" ...... قربانیٔ نفس ہے۔ آپ فرماتے تھے کوئی تارکِ نماز وارثی نہیں ہو سکتا' وارثی فقیر کی پہچان یہ بتائی کہ اس کے پاس خدا کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔ اس کے لئے سوال حرام ہے وہ زمین کو بستر بناتا ہے۔ اس کا تکیہ اللہ پر ہوتا ہے اس لئے تکیہ سے بھی بے نیاز ہے' وہ شادی اور بچوں وغیرہ کے جھمیلے میں نہیں پڑتا تعویذ گنڈا نہیں کرتا' مکان نہیں بناتا' مال واسباب جمع نہیں کرتا' سواری کا انتظام نہیں کرتا' وہ جیتے جی مر جاتا ہے' زرد چادریں اس کا کفن ہیں وہ کرتہ پاجامہ ٹوپی وغیرہ کچھ نہیں پہنتا' فرماتے تھے ہم فقیر بنانا چاہتے ہیں پیر اور شیخ نہیں بنانا چاہتے ہمارا کوئی جانشین نہیں اس لئے کہ عشق میں جانشینی نہیں ہوتی' بھلا مجنوں کا بھی کوئی جانشین تھا؟ عاجزی کی اپنے عمل سے تشریح یوں کی کہ ایک مرتبہ گلی سے گزر رہے تھے۔ ایک کُتا سامنے آگیا آپ نے اپنی چادروں کو سمیٹ لیا۔ ایک مرید ہمراہ تھے۔ انہوں نے بھی ایسا ہی کیا' آپ نے مسکرا کر پوچھا "تم نے ایسا کیوں کیا" عرض کیا "تاکہ میرا احرام ناپاک نہ ہو جائے"۔ فرمایا "مگر میں نے تو اس لئے احرام سمیٹا کہ مجھ ننگِ وجود کے لباس سے چُھو کر کہیں خود کتا ناپاک نہ ہو جائے"۔

نماز میں آپ کے شغف کا یہ عالم تھا کہ وفات کے قریب ایک ایک نماز کو غلبۂ شوق میں بار بار ادا کرتے۔ لوگ عرض کرتے کہ ابھی تو آپ نماز ادا کر چکے ہیں تو فرماتے "خیر پھر پڑھ لی' اس سے تمہارا کیا حرج ہُوا"۔ روزے داری کا یہ عالم تھا کہ آپ "دائم الصوم" ہو گئے۔ سات سات دن مسلسل روزہ رکھتے' عمر کے آخری حصے میں یادِ خدا اتنی غالب تھی کہ عرض کیا جاتا "کھانا کھا لیجئے" آپ فرماتے "ابھی تو کھایا ہے"۔

آپ کی شان قلندرانہ اور مجذوبانہ تھی۔ ایسی شخصیتیں خال خال پیدا ہوتی ہیں اور مستثنیات میں شمار ہوتی ہیں' عام لوگ ان کی پیروی نہیں کر سکتے۔ ان کا کام فقیروں اور صوفیوں کی ایک ایسی جماعت پیدا

کرنا ہوتا ہے، جو خلقِ خدا کی روحانی پیاس بجھائے، شادی بیاہ نہ کرنے کی پابندی آپ اپنی بیعت کرنے والے تمام افراد سے نہیں کراتے تھے مگر روحانیت کی منزلیں طے کر کے فقر کے درجے پر فائز ہونے والے اصحاب کے لئے اس کا اہتمام ضروری قرار دیتے تھے، صوفیائے کرام میں اور بھی بزرگ ایسے گزرے ہیں جنہوں نے (بیوی بچوں کے بغیر) مجرّدانہ زندگی گزاری جیسے سلسلۂ چشتیہ کے نامور بزرگ حضرت خواجہ نظام الدین محبوب الٰہیؒ بلکہ ان کا تو یہ قول خاصا مشہور ہے کہ "متاہل (اہل و عیال والا) ہونا رخصت ہے اور مجرّد ہونا عزیمت" حضرت یحییٰ علیہ السّلام اور حضرت عیسیٰ علیہ السّلام نے شادی نہیں کی اور ان کے اس فعل کو قرآن نے سراہا ہے، رسولِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی بات دوسری ہے وہ ہر کہ و مہ کے لئے قابلِ عمل نمونۂ زندگی بن کر تشریف لائے تھے۔ صوفیاؒ اور اولیاؒ ایک شعبۂ خاص میں خدمات انجام دیتے ہیں اس لئے غلبۂ حال میں ان کے انفرادی خصائل کو فقہی موشگافیوں کا موضوع ٹھہرانا صحیح نہیں، تقریباً 84 سال کی عمر میں جب آپ کا انتقال ہوا ہے تو آپ سترہ بار حج کر چکے تھے ان میں سے کئی حج پاپیادہ تھے شاید اسی وجہ سے آج بھی تصوّف کے دوسرے سلسلوں کے مقابلے میں وارثی سلسلہ میں سب سے زیادہ حاجی پائے جاتے ہیں، آپ کے جنازے میں اتنا اژدہام تھا کہ سترہ مرتبہ آپ کی نماز جنازہ پڑھی گئی، حضرت بیدم شاہ وارثی نے "سلامِ عاشقانہ" کہا......،

سلام اے شمعِ بزمِ مصطفائی
سلام اے نورِ چشمِ مرتضائی
سلام اے روحِ زہراؓ جانِ حسنینؓ
سلام اے زینتِ گلزارِ کونین
میں اُس ارضِ مقدّس پر ہوں قرباں
کہ آسودہ ہے تُو جس میں مری جاں
دلِ مہجور لائے تاب کب تک
یہ آخر نیند کب تک خواب کب تک
میں صدقے میٹھی نیندیں سونے والے
ذرا رخسار سے چادر ہٹا لے
اُٹھ اے سروِ خراماں جانِ بیدمؔ
بہارِ گلشنِ ایمانِ بیدمؔ

مشہور بزرگ حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ نے فرمایا......

"حاجی وارث علی شاہ جیسا موحد (توحید پرست) پھر دیکھنے میں نہیں آیا"

حضرت حاجی صاحبؒ کی محبت و عقیدت سے میرا دل برسوں سے سرشار چلا آ رہا تھا، میں نے کہیں

پڑھا تھا کہ ترجمانِ حقیقت علاّمہ اقبالؒ بھی آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے تھے اور ان کے قلب پر تجلّیات کی جو بارش ہوئی تھی اس کے متعلق پوچھنے پر صرف اتنا بتایا تھا کہ

"یہ واقعہ اتنا حیران کُن ہے کہ بتاؤں تو دنیا والے اسے صحیح تسلیم نہیں کریں گے" میری خوش قسمتی تھی کہ اس آستانِ مقدس کی چوکھٹ چومنے کے لئے آج میں بھی سفر میں تھا' ہمارے ساتھ تین گاڑیاں تھیں یہ سب انڈیا میں بنی ہوئی "ایمبیسیڈر" گاڑیاں تھیں' یہاں کے وزرائے کرام بھی انہی دیسی گاڑیوں سے سفر کرتے ہیں مگر ان گاڑیوں کی "مضبوطی" کا یہ عالم ہے کہ ان میں سے ایک گاڑی تو راستے ہی میں خراب ہو کر داغِ مفارقت دے گئی' ڈاکٹر عمار رضوی نے پولیس کی گاڑی بھی آگے لگوالی تھی مجھے شان و شوکت کا یہ مظاہرہ ایک آنکھ نہیں بھا رہا تھا مگر راستے میں زائرین کی بھیڑ بھاڑ دیکھی اور کھوے سے کھوا چھلتا دیکھا تو پولیس گاڑی کی حکمت سمجھ میں آ گئی۔ مزار سے متصل آٹھ راستوں پر بازار لگے ہوئے تھے جن میں کھانے پینے کی چیزوں سے لیکر دنیا جہان کی ہر چیز مل رہی تھی' ایک بات عجیب و غریب دیکھی مٹھائیوں وغیرہ کے کئی اسٹال تھے لیکن کہیں مکھی نہیں دیکھی' کہتے ہیں یہ آپ کا تصرّفِ خاص ہے' ایک ایک بازار کئی کئی میل لمبا تھا۔ معلوم ہوا کہ ان بازاروں میں اپنا مال لانے کے لئے دکاندار مہینوں تیاری کرتے ہیں اور عرس کے بعد بھی کئی کئی دن یہ بازار سجے رہتے ہیں تا آنکہ ایک ایک آئٹم بک جاتا ہے' زائرین میں مسلمانوں سے زیادہ نہیں تو ہندو اور سکھ کم بھی نہیں تھے اتنا ہجوم میں نے زندگی میں حج کے سوا کہیں نہیں دیکھا' اجمیر شریف عرس کے موقع پر میرا جانا نہیں ہوا' کہتے ہیں وہاں بھی کم و بیش یہی صورت ہوتی ہے' مزار پر باطنی انوار کی تو بارش ہو رہی تھی بجلی کی رنگا رنگ روشنیوں سے بھی یہ بقعۂ نور بنا ہوا تھا' بازار کے اندر گاڑیوں کی آمدورفت منع تھی مگر وزیر کی گاڑی کو پولیس والے مزار تک اندر لے گئے اگر پیدل جانا ہوتا تو شاید کئی گھنٹے لگ جاتے' یہاں بعض پاکستانی زائرین بھی نظر پڑے' عرس کمیٹی کے اراکین ہمارے انتظار میں تھے' دھکّے کھاتے کھلاتے ہمیں قبر مبارک تک لے گئے' یہاں فاتحہ پڑھی' دعا کی' تبرک میں ایک چادر بھی عطا ہوئی' انڈین کونسل آف کلچرل ریلیشنز یو پی کے ڈائریکٹر مسٹر ماتھر ہمارے ہمراہ تھے۔ حضرت حاجی صاحب سے ان کی عقیدت اور چادر کے لئے آن کا حسنِ طلب دیکھ کر میں نے چادر انہیں دیدی' کچھ نہ پوچھئے ان کی کیا حالت ہوئی' پھولے نہ سما رہے تھے کہا میری ماں کو کتنی خوشی ہوگی میں بتا نہیں سکتا' مجھے تو کئی ماہ سے حضرت وارث پاک خواب میں یہاں بلا رہے تھے مجھے معلوم نہیں تھا کہ مجھے اتنا بڑا تحفہ ملنے والا ہے'

ایک شام یو پی پریس کلب نے میرے اعزاز میں "میٹ دی پریس" کا پروگرام ترتیب دیا' پچاس ساٹھ صحافی شریکِ مجلس تھے' میرے مختصر اظہارِ خیال کے بعد سوالات کا سلسلہ شروع ہوا' میں پاکستان کی اندرونی سیاست کو زیرِ بحث نہیں لانا چاہتا تھا پھر بھی بچتے بچاتے میں نے بہت سی غلط فہمیوں کا ازالہ کرنے کی کوشش کی' بہت سے سوالات کراچی کی صورتحال کے بارے میں تھے' مہاجر قومیت پر دیر تک گفتگو رہی' یہاں کے صحافیوں کا زور اس پر تھا کہ "اس کا مطلب ہے وہاں مہاجر اب تک مہاجر ہے" ایک سوال

انڈیا کے انتخابی نتائج کے بارے میں تھائیں نے کہا "میرا یہ منصب نہیں کہ آپ کے اندرونی معاملات پر رائے دُوں" دوبارہ اصرار ہوا تو عرض کیا "جو بھی جیتا اتنی بات طے ہے کہ اب کے وہ زیادہ مستحکم حکومت ہم نہیں کر سکے گا"۔

خواہش تھی کہ دارالمصنفین اعظم گڑھ کا بھی چکّر لگاؤں گا، حضرت مولانا شبلی نعمانی اور حضرت علامہ سیّد سلیمان ندوی کی سربراہی میں اس ادارے نے اسلامی تاریخ و ثقافت کی بڑی گرانقدر خدمات انجام دی ہیں، اس کے سابق مہتمم مولانا صباح الدین عبدالرحمٰن مرحوم ہمارے دَورِ حکومت میں پاکستان تشریف لائے تھے تو کچھ حقیر خدمت اس ادارے کی میں نے بھی کی تھی، تب سے ادارے کے کارپرداز چاہتے ہیں کہ وہاں حاضری دُوں، یہاں آکر حاضری کے ارادے کی اطلاع بھی دارالمصنفین کو کرا دی گئی تھی مگر پتہ چلا کہ ہوائی جہاز ادھر جاتا نہیں، ٹرین کئی جگہ بدلنی پڑتی ہے اور سڑک کے ذریعے آنے جانے میں تقریباً چودہ گھنٹے لگ جائیں گے پھر سڑک بھی کچھ خاص نہیں اور اس پر مستزاد انڈیا کی ایمبیسیڈر گاڑی...... ایک وزارتی گاڑی کا حشر میں دیوہ شریف کے سفر میں دیکھ چکا تھا، لاچار ارادہ ترک کرنا پڑا مگر دارالمصنفین دیکھنے کی حسرت اب تک دل میں موجزن ہے، دیکھئے! قسمت کب یاوری کرتی ہے۔

کلکتہ کا سفر

کلکتہ سالہا سال برِ صغیر پاک و ہند میں برطانوی حکومت کا دار السلطنت رہا ہے اور اس وقت آبادی کے لحاظ سے دنیا کا تیسرا بڑا شہر ہے۔ شہر کیا ہے یوں کہئے کئی شہروں کا مجموعہ ہے' اسے دیکھنے کا بڑا اشتیاق تھا' دو سال پہلے میں ہانگ کانگ سے کھٹمنڈو جا رہا تھا تو ہوائی جہاز کلکتہ ایئرپورٹ پر بھی رُکا تھا۔ جب اعلان ہوا کہ اب جہاز کلکتہ کے بین الاقوامی ہوائی اڈے پر اُترنے والا ہے تو میں نے کھڑکی سے شہر کا نظارہ کرنے کی کوشش کی مگر ہوائی اڈہ شہر سے بہت دُور ہے۔ مجھے سوادِ شہر کے سوا کچھ نظر نہ آیا اس وقت سے حسرت تھی کہ زندگی رہی تو اِدھر کا چکر ضرور لگاؤں گا' کلکتہ ٹیگور کی سرزمین ہے' ڈھاکہ یہاں سے بیس منٹ کی پرواز پر واقع ہے' مولانا ابو الکلام آزاد نے "الہلال" کا اجراء اسی شہر سے کیا تھا۔ نواب واجد علی شاہ یہیں مٹیا برج میں نظر بند رہے تھے۔ یہاں قدم قدم پر ہماری تاریخ بکھری ہوئی ہے' غالبؔ جیسا شاعر یہاں سے ہو کر گیا تو مدۃ العمر اس خطے کو یاد کرتا رہا' اس کا وہ قطعہ اردو ادب کے کس طالبعلم کو یاد نہ ہوگا؛

کلکتے کا جو ذکر کیا تُو نے ہم نشیں

اک تیر میرے سینے میں مارا کہ ہائے ہائے

لکھنؤ سے انڈین ایئرلائنز کی پرواز براہِ راست نہیں' یہ پٹنہ اور رانچی رُکتی ہوئی جاتی ہے اس طرح یہ کوئی ساڑھے تین پونے چار گھنٹے کا سفر بن گیا' جہاز پٹنہ اترا تو مجھے بہار کے پاکستانی مسلمان بہت یاد آئے جو آج پاکستان سے محبت کرنے کے جرم میں ڈھاکہ کے کیمپوں میں پڑے پاکستان آنے کا انتظار کر رہے

ہیں۔ صدر جنرل ضیاء الحق بنگلہ دیش کے دورے پر گئے تو یہ غریب انتظار ہی کرتے رہ گئے کہ شاید پاکستان کا اسلام دوست حکمران بھولے سے اِدھر بھی آجائے' وزیر اعظم بے نظیر بھٹو تشریف لے گئیں تو ان کے اس جلوس پر لاٹھی چارج ہوا جو اپنی جمہوریت نواز لیڈر کا خیر مقدم کرنا چاہتا تھا' حکومت کا عذر یہ ہے کہ ان کی آباد کاری کے لئے سرمایہ موجود نہیں اور ظاہر ہے جن عوامی نمائندوں کی ترجیح ووٹوں کی خرید و فروخت ہو اور اس مقصد کے لئے ان بے چاروں کو کروڑوں روپے خرچ کرنے پڑ رہے ہوں وہ بہار کے پاکستانی مسلمانوں کو پاکستان لا بسانے کے وسائل کہاں سے لائیں؟ پٹنہ کے ہوائی اڈے پر فارسی زبان کا یہ شعر بار بار یاد آتا اور تڑپاتا رہا۔

خونے نکردہ ایم و کسے را نکشتہ ایم
جرمم ہمیں کہ عاشقِ روئے تو گشتہ ایم

(نہ ہم نے خون کیا ہے اور نہ کسی کو قتل' ہمارا جرم صرف اتنا ہے کہ ہم تم سے عشق کرنے کی غلطی کر بیٹھے ہیں۔)

ادب اور سیاست کے حوالے سے مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی کا نام ایک بڑا معتبر اور روشن نام ہے' مولانا ملیح آبادی' حضرت مولانا ابوالکلام آزاد کے دستِ راست تھے اور "الہلال" میں ان کے شریکِ ادارت' وہ "امام الہند" کی شخصیت اور ان کی علمی و ادبی خصوصیت میں ایسے فنا ہوئے کہ ان کے اسلوب کو مولانا آزاد کی طرزِ نگارش سے جُدا کرنا دشوار ہو گیا ہے' "انسانیت موت کے دروازے پر" اور دوسری کتنی ہی کتابیں ہیں جو آج مولانا آزاد کے نام سے مارکیٹ میں موجود ہیں۔ حقیقت میں وہ مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی ہی کے زورِ قلم کا نتیجہ ہیں' "الہلال" میں مضمون نگاروں کے نام شائع نہیں ہوتے تھے۔ بعد میں پبلشروں نے اس کی فائلوں سے مختلف مضامین نکال کر الگ الگ مجموعے شائع کئے تو ان پر مولانا ابوالکلام آزاد ہی کا نام بطور مصنّف درج کر دیا۔ ان میں سے بیشتر مجموعے مولانا ملیح آبادی کی علمی کاوش ہیں' مولانا نے 1929ء میں کلکتہ سے "الہند" کے نام سے ایک اردو روزنامہ جاری کیا تھا جو آج بھی "آزاد ہند" کے نام سے جاری ہے اور یہاں کا سب سے بڑا اردو اخبار ہے' آفسٹ پر چھپتا ہے اور کلکتہ کے علاوہ بہار کے شہروں اور قصبوں میں بھی شوق سے پڑھا جاتا ہے۔ اس کے ایڈیٹر جناب احمد سعید ملیح آبادی انہی مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی کے فرزند ارجمند ہیں۔ سعید صاحب لاہور کی اسلامی سربراہی کانفرنس کے موقع پر پاکستان تشریف لائے تو میں اس وقت وزیر اطلاعات و نشریات تھا' مجھ سے دو مرتبہ ملے' انٹرویو بھی کیا اور اپنی علم دوستی اور پُرکشش شخصیت کا نقش دل پر چھوڑ گئے' واپسی پر اپنے اخبار میں پاکستان کا ایک نہایت خوبصورت سفرنامہ لکھا جو بعد میں کتابی صورت میں بھی شائع ہوا۔

اب اس سارے زمانے میں جناب احمد سعید سے کوئی رابطہ تو نہیں تھا مگر ان کے والدِ ماجد کے احترام اور بھارت کی اردو صحافت میں ان کے ذاتی مقام کی وجہ سے ان کی یاد برابر دل میں رہی' میں نے لکھنؤ سے

انہیں کلکتہ آنے کی خبر دی تو وہ بے حد خوش ہوئے' بتایا کہ وہ "آزاد ہند" میں "جنگ" سے مشاہدات و تاثرات" کے زیرِ عنوان میرے مضامین بالالتزام شائع کرتے رہے ہیں اور یہاں کے لوگوں کے لئے میرا نام اور میری فکر کسی اعتبار سے اجنبی نہیں' چنانچہ جب میں کلکتہ پہنچا تو معلوم ہوا کہ میری کتاب "اور لائن کٹ گئی" آج کل ان کے زیرِ مطالعہ ہے' کتاب کلکتہ کے کوئی صاحب کراچی سے لیکر گئے تھے اور وہ کئی ہاتھوں سے ہوتی ہوئی اب ان تک پہنچ پائی تھی۔

کلکتہ پہنچا تو اس کی رونق دامنِ دل کو کھینچ رہی تھی مگر ایسا لگا جیسے غم اور فکر کی ایک وسیع و عریض چادر کسی نے پورے شہر پر تان دی ہے' بلا امتیاز مذہب و ملت ہر شخص کچھ بجھا بجھا اور دل گرفتہ سا نظر آیا' لوگوں سے بات کی تو پتہ چلا مشہور ہمدرد خلائق خاتون "مدر ٹریسا" دل کے عارضے سے ہسپتال میں داخل ہیں، اور لوگوں کو دھڑکا لگا ہے کہ کہیں ان کا بسترِ علالت' بسرِ مرگ ہی ثابت نہ ہو' مدر ٹریسا ایک عیسائی مشنری کارکُن ہیں' زندگی کے 79 سال گزار چکی ہیں۔ اپنی پوری زندگی انہوں نے جذام زدہ لوگوں کے علاج معالجہ اور تیمارداری کے لئے وقف کر رکھی ہے' اس مقصد کے لئے انہوں نے کئی ہسپتال اور رفاہی ادارے تعمیر کئے ہیں اور ہزاروں لوگ جن سے اپنے بھی کوڑھ لگنے کے ڈر سے کوسوں دُور بھاگتے تھے مدر ٹریسا کے آغوشِ مادری میں آکر باعزت زندگی گزارنے کے قابل بن گئے ہیں۔ مدر ٹریسا کی بے لوث انسانی خدمت نے انہیں ہر مذہب و ملّت کے لوگوں کی آنکھوں کا تارا بنا دیا ہے۔ ایک تو وہ سن رسیدہ ہیں دوسرے رات دن سفر میں رہتی ہیں دنیا کے مختلف ملکوں میں خدمتِ خلق کے بہت سے ادارے ان کے اہتمام میں، کام کر رہے ہیں یہاں تک کہ سوویت یونین میں بھی ان کے تین مشن موجود ہیں' 83ء میں انہیں پہلی بار دل کا دورہ پڑا اس کے باوجود ان کی انتھک محنت میں کوئی فرق نہیں آیا' اب وہ سخت بیمار پڑی ہیں تو کلکتہ کا پورا شہر ان کی جُدائی کے تصوّر سے ابھی سے سوگوار ہے' چھوٹے بڑے ہندو مسلمان سب ان کی صحت یابی کے لئے دست بدعا ہیں' صدر بش اور روس کے وزیر اعظم نے ان کی عیادت کے لئے تار دیئے ہیں اور راجیو گاندھی اپنی بیوی کے ساتھ بنفسِ نفیس ان کی مزاج پرسی کے لئے کلکتے پہنچے ہیں' ہر رکشے والا اور ہر ٹیکسی ڈرائیور "ماتا" کے لئے فکر مند ہے اور اپنی ہر سواری سے ان کی صحت کے لئے دعا کرنے کی درخواست کرتا ہے۔ میں نے دنیا میں بڑے بڑے اربابِ اقتدار دیکھے ہیں لیکن اس بوڑھی اور ضعیف خاتون کی حکومت کے سامنے سب کا اقتدار ہیچ ہے۔ ان کا سکّہ جسموں پر چلتا ہے۔ یہ دلوں پر راج کرتی ہیں۔ بندگانِ خدا کی خدمت بھی کیا چیز ہے' آخرت میں تو اس کا صلہ ملے گا ہی' دنیا میں بھی یہ انسان کو محبوبِ خلائق بنا دیتی ہے۔

میری خواہش تھی کہ میں بھی "مدر ٹریسا" کے چرن چھوؤں' پاکستان کے عوام کی طرف سے ان کی عیادت کروں مگر جب ان کے کارکنوں سے رابطہ کیا تو معلوم ہوا کہ اُن پر ڈاکٹروں نے کسی سے ملنے ملانے اور بات کرنے پر سختی سے پابندی عائد کر رکھی ہے۔ وہ اپنے ملاقاتیوں کو دیکھتی ہیں تو حسبِ معمول جذباتی

انداز میں اپاہجوں اور لاچاروں کی خدمت پر بات چیت شروع کر دیتی ہیں اور اس کا ان کے قلب پر گہرا اثر پڑتا ہے' اب واپس آیا ہوں تو اخبارات سے معلوم ہوا ہے کہ ان کی حالت پہلے سے بہتر ہے' خدا انہیں اپنے معذور بندوں کی خدمت کرنے کے لئے تادیر سلامت رکھے!

اگلے دن صبح یہاں کی مشہور مسجد ''مسجدِ ناخدا'' دیکھنے کا پروگرام تھا' مسجدِ ناخدا مولانا ابوالکلام آزاد کے والدِ ماجد مولانا خیرالدین نے تعمیر کرائی تھی جو اپنے وقت کے ایک مانے ہوئے پیر بھی تھے۔ کچھی میمن برادری ان کی مرید تھی جو کلکتہ کی تجارت پر چھائی ہوئی تھی' خاص طور پر جہازرانی پر تو انہی کی اجارہ داری تھی' مسجد ان کے دیئے ہوئے چندے سے بنی۔ اس لئے ان کے پیشے کی نسبت سے اسے ''مسجدِ ناخدا'' کا نام دیا گیا۔ یہ شہر کے وسط میں چار منزلوں پر مشتمل تعمیر ہوئی ہے۔ جمعہ کے دن پوری کی پوری مسجد نمازیوں سے بھر جاتی ہے اور سڑک پر بھی صفیں بچھ جاتی ہیں' مسجد کے خطیب مولانا محمد صابر صاحب ایک بزرگ شخصیت ہیں' میری آمد کا سن کر تشریف لے آئے' مشروبات سے خاطر تواضع کی اب تک پاکستان نہیں آسکے' بتایا کہ حج کے موقع پر کچھ پاکستانی حاجی ان کے ساتھ قیام پذیر تھے ان سے مل کر ان کا دل بہت خوش ہوا' میں نے کہا آپ پاکستان تشریف لائیں گے تو لوگ آپ کو سر آنکھوں پر بٹھائیں گے' ہمارے ہاں عیدِ میلاد کے موقع پر ہر شہر میں جلسے ہوتے ہیں اور لگاتار ہوتے ہی رہتے ہیں۔ کوئی انجمن اگر ''مسجدِ ناخدا کلکتہ کے خطیب'' کو اپنے کسی جلسے میں مدعو کرلے تو کیا ہی اچھی بات ہو!

میں نے مولانا سے عرض کیا ''یہاں کے کسی اسلامی دارالاشاعت کو دیکھنا چاہتا ہوں'' فرمایا ''قریب ہی دارالاشاعت الاسلامیہ کلکتہ کا مکتب ہے ابھی اپنے بیٹے کو بھیج کر اطلاع کرائے دیتا ہوں''۔ میرے سیکرٹری علامہ سعید الرشید عباسی ساتھ تھے وہ بھی ان کے بیٹے کے ساتھ ہو لئے' علامہ صاحب کا ایک حادثہ میں بازو ٹوٹ گیا تھا اس پر پلستر چڑھا ہوا تھا اور وہ ابھی پاکستان میں زیرِ علاج تھے مگر یہ ان کا خلوص تھا کہ اس طویل سفر میں بھی میرے ساتھ ہو لئے۔ چند ہی منٹوں میں یہ دونوں واپس آئے اور اطلاع دی کہ دارالاشاعت کے ناظم مولانا عطاء الرحمٰن قدوسی میرا انتظار کر رہے ہیں۔ ہم پُررونق بازار میں پیدل ہی چل پڑے یہ پورا علاقہ مسلمانوں کا ہے اور اکثر و بیشتر دکاندار بھی مسلمان ہیں یوں لگا جیسے اپنے ہی ملک میں چل پھر رہے ہیں۔ دارالاشاعت کے ناظم مولانا قدوسی ستر سال کے پیٹے میں ہیں لیکن ماشا اللہ جوان لگتے ہیں ملے تو بڑی مسرت کا اظہار کیا چائے منگوائی اور پھر یہاں کے ایک ممتاز عالمِ دین اور اللہ والے بزرگ مولانا حکیم محمد زماں حسینی سے ملانے اُٹھ کھڑے ہوئے۔ مولانا حسینی دارالعلوم دیوبند کی شوریٰ کے رکن ہیں۔ ان کا درسِ قرآن یہاں بہت مقبول اور مشہور ہے۔ سراپا بھی اتنا نورانی ہے کہ انہیں دیکھ کر ہی خدا یاد آنے لگتا ہے۔ مہتمم دارالعلوم دیوبند حضرت قاری محمد طیب مرحوم کا ذکر آیا تو آبدیدہ ہو گئے ان کے شاگرد رہے ہیں اس لئے ان کا نام لینے کے بجائے بڑے ادب سے ''حضرت مہتمم صاحب'' کہہ کر ان کا تذکرہ کرتے ہیں۔ طبیب ہیں اور اس وقت اپنے مطب میں بیٹھے تھے اپنی دو کتابیں بھی مرحمت فرمائیں اور یہ ان کا کرم تھا کہ شام کو مسلم انسٹیٹیوٹ بنگال کی طرف سے میرے اعزاز میں ہونے والے استقبالیہ میں بھی تشریف آوری کا عندیہ ظاہر کیا۔

شام کو مسلم انسٹیٹیوٹ بنگال کے ہال میں میرے اعزاز میں ایک استقبالیہ منعقد ہوا' اس کے مہتمم ظاہر ہے ہمارے پرانے مہربان جناب احمد سعید ملیح آبادی تھے اور یہ ان کی با اثر اور ہمہ گیر شخصیت کا کمال تھا کہ اس مجلس میں کلکتہ کے مسلمانوں کے تقریباً تمام ہی طبقات کی بھرپور نمائندگی تھی' پروفیسر' ادیب' صحافی' شاعر' تاجر' علماء اور سیاستدان سبھی مجھ ہیچ مدان کی قدر افزائی کے لئے کھچے چلے آئے تھے' صدارت یہاں کی ہائیکورٹ کے جج جسٹس خواجہ محمد یوسف کر رہے تھے اور ان کے ساتھ سٹیج پر مولانا حکیم محمد زمان حسینی' جناب کلیم الدین شمس (سابق ڈپٹی سپیکر مغربی بنگال اسمبلی)' جناب سلیمان خورشید جنرل سیکرٹری مسلم انسٹیٹیوٹ اور میرے علاوہ خود جناب احمد سعید ملیح آبادی تشریف فرما تھے۔ کلکتہ سے روزنامہ "آزاد ہند" کے علاوہ سات دوسرے اردو اخبار بھی شائع ہوتے ہیں جن میں اخبار مشرق اور اقراء خاص طور پر قابل ذکر ہیں' ان اخبارات میں کام کرنے والے صحافی بھی بڑی تعداد میں موجود تھے' مسلم انسٹیٹیوٹ بنگال کی بہت پرانی تنظیم ہے اسے قائم ہوئے ایک سو سال ہونے کو ہیں۔ اس بلڈنگ میں ایک بڑی لائبریری کے علاوہ سپورٹس کلب اور ایک میرج ہال بھی شامل ہے اور اراکین کے چندوں کے علاوہ ان دونوں مدات سے بھی انسٹیٹیوٹ کو معقول آمدنی ہوتی ہے۔ اس کے اراکین کو تو استقبالیہ میں آنا ہی تھا مدرسہ عالیہ کلکتہ کی بھی یہاں نمائندگی تھی۔ مدرسہ عالیہ کلکتہ کا نام میں نے بہت سن رکھا تھا۔ یہ انگریز کے زمانے سے قائم چلا آرہا ہے اور دینی و دنیوی دونوں علوم کا جامع ہے۔ اس کے ایک بزرگ پروفیسر نے مجھے مدرسہ دیکھنے کی دعوت بھی دی اور میرا دل بھی بہت چاہتا تھا کہ مدرسہ کی علمی فضا میں کچھ وقت بسر کروں مگر یہاں ایک تو قیام مختصر تھا پھر پروگرام بھی اتنے بنتے چلے گئے اور ہوٹل میں ملاقات کے لئے آنے والوں کا تانتا بھی اتنا بندھا رہا کہ یہ خواہش پوری نہ ہو سکی استقبالیہ میں جناب احمد سعید کی تعارفی تقریر کے بعد یہاں کے بعض مشہور شعرائے کرام نے اپنا کلام پیش کیا اور اس طرح میری تقریر سے قبل یہ محفل ایک اچھی خاصی محفلِ مشاعرہ میں تبدیل ہو گئی' اشعار یوں تو سارے ہی اچھے تھے مگر ایک شعر خاص طور پر حافظے پر نقش ہو کر رہ گیا ہے۔

مسافر تھے' مسافر ہیں' مسافر بن کے جینا ہے
کراچی ہو کہ دلّی ہو مہاجر بن کے جینا ہے

اگلے دن روزنامہ "اقراء" کے ایڈیٹر عمر حیات خان صاحب تشریف لے آئے "اقراء" بھی آفسٹ پر چھپتا ہے اور اچھا خاصا خوبصورت اخبار ہے۔ خان صاحب نوجوان آدمی ہیں یہی کوئی 35 برس کے ہوں گے۔ پاکستان کی سپریم کورٹ کے ریٹائرڈ جج جناب صلاح الدین کے قریبی عزیز ہیں۔ اپنے والد ماجد الماس خان مرحوم کے نام پر "الماس گروپ" کے نام سے انہوں نے ایک کاروباری کمپنی قائم کی ہے جس کے تحت ان کا پرنٹنگ پریس بھی کام کر رہا ہے اور بعض جرائد بھی شائع ہو رہے ہیں۔ پاکستان آتے جاتے رہتے ہیں اس لئے یہاں کے حالات سے باخبر ہیں ان کے ساتھ پاک بھارت تعلقات پر بڑی اچھی گفتگو رہی۔

کلکتہ کے مشہور انگریزی اخبار ''ٹیلیگراف'' کا ایک رپورٹر بھی انٹرویو لینے آیا' ہندوستان میں محترمہ بے نظیر بھٹو کے بعد دوسری مشہور ترین شخصیت عمران خان کی ہے۔ رپورٹر جانتا تھا کہ عمران خان بھی نیازی ہیں اس لئے شاید میں ان کی ترجمانی کے فرائض انجام دے سکوں گا (عمران خان کا تعلق بھی ضلع میانوالی سے ہے اور ان کی حقیقی چچازاد بہن میرے فرسٹ کزن عزیزم ڈاکٹر اکبر نیازی سے بیاہی ہوئی ہیں' اس لحاظ سے وہ میرے رشتہ دار بھی ہیں' لیکن بدقسمتی سے میں کرکٹ سے نابلدِ محض ہوں اور عمران خان سے کبھی میری ملاقات نہیں ہوئی) یہاں پچھلے دنوں پریس میں ایک سٹوری شائع ہوئی ہے جس میں بتایا گیا ہے کہ عمران خان عنقریب سیاست کے میدان میں اُترنے والے ہیں' تب سے یہاں کے اخبار نویس اس کھوج میں ہیں کہ یہ واقعہ کب ہوگا اور ہوگا بھی تو کس رنگ میں ہوگا؟ عمران بے نظیر کا ساتھ دیں گے یا ان کے مدِّمقابل اپوزیشن لیڈر کا رول ادا کریں گے۔

''ادارہ انشائے ماجدی کلکتہ'' کے پروپرائٹر جناب مولوی منظور علی نے بھی تشریف ارزانی کی' میں لکھنؤ میں تھا تو حضرت مولانا عبدالماجد دریاآبادیؒ کے داماد اور جانشین حکیم عبدالقوی صاحب نے ان کا ذکر کیا تھا' مولوی منظور صاحب پبلشر ہیں مگر انہوں نے صرف مولانا دریاآبادی مرحوم کی کتابیں شائع کی ہیں اور اس میں شک نہیں کہ بڑی نفاست اور اہتمام سے شائع کی ہیں' ایک سیٹ مجھے بھی پیش کیا' ساٹھ ستّر کتابیں مجھے لکھنؤ میں ملی تھیں اب کلکتہ میں بھی اچھی خاصی کتابیں جمع ہوگئی ہیں' بنگلور' حیدر آباد دکن اور دہلی کے عطیاتِ کتب اس کے علاوہ ہیں' دہلی میں تو مکتبۂ جامعۂ ملّیہ سے میں نے خود بھی بہت سی کتابیں خریدیں' یہ سب مل ملا کر تین سو سے کم کیا ہوں گی' ''انڈین کونسل آف کلچرل ریلیشنز'' کے کار پردازوں کا کہنا تھا کہ یہ سارا بوجھ تم کہاں کہاں اٹھائے پھرو گے ہمارے حوالے کر دو ہم انہیں اسلام آباد کے بھارتی سفارت خانے کی وساطت سے تم تک پہنچا دیں گے مجھے واپس آئے ڈیڑھ ماہ کا عرصہ ہوگیا ہے لیکن ابھی تک کتابوں کا کوئی نام ونشان نہیں' یقین جانئے میری جان ان کتابوں میں اٹکی ہوئی ہے! (خدا کا شکر ہے کہ اب جب یہ سفرنامہ کتابی صورت میں شائع ہو رہا ہے تو کتابیں مل چکی ہیں) ایک تقریب میرے اعزاز میں یہاں کی ساہتیہ اکیڈمی نے بھی منعقد کی' اسے ہمارے ہاں کی ''اکادمی ادبیات'' (اکیڈمی آف لیٹرز) سمجھیے' ہر صوبے میں ادب اور ادیبوں کے فروغ کے لئے بھارت کی یہ اکیڈمیاں بہت سرگرمی سے کام کر رہی ہیں۔ کلکتہ کے ممتاز اہلِ قلم' شاعر' ادیب' صحافی اس محفل میں شریک تھے اور چونکہ یہاں کمیونسٹ پارٹی کی حکومت ہے اس لئے قدرتاً ان میں اکثریت مارکسی نظریات رکھنے والے حضرات کی تھی۔ پاکستان میں ''رُشدی'' کے خلاف جو تحریک چلی ہے اس حوالے سے میرا نام ان کے لئے غیر معروف نہ تھا اس لئے رسمی اور افتتاحی کلمات کے بعد جلد ہی محفل ''رُشدی'' کے مسئلہ پر ایک باقاعدہ مجلسِ مذاکرہ میں تبدیل ہوگئی' کچھ اصحاب آزادیٔ اظہار اور بنیادی انسانی حقوق کے زیرِ عنوان اس کے خلاف عالمی تحریک کے جواز کو زیرِ بحث لانا چاہتے تھے۔ خدا کا شکر ہے کہ اس نے میری زبان کی

گرہیں کھول کر ذہنوں میں لگے جالے صاف کرنے کی توفیق عطا فرمائی 'ایک گھنٹے کی سیر حاصل گفتگو کے نتیجے میں ہاؤس کا مجموعی فیصلہ میرے حق میں تھا۔

استقبالیے میں ہندی کے ادیب بھی تھے اور بنگالی اور انگریزی کے بھی 'کمیونسٹ بھی اور غیر کمیونسٹ بھی مگر یہ دیکھ کر تعجب ہوا کہ کمیونسٹ اہلِ قلم شدّومد سے "رُشدی" کی مذمت کر رہے تھے' بنگال کمیونسٹوں کا گڑھ ہے اور یہاں کے وزیر اعلیٰ مسٹر باسو عوام میں بے حد مقبول ہیں۔ فرقہ وارانہ فسادات بھی یہاں بہت کم ہوتے ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ مسلمان یہاں دوسری متعصب طاقتوں سے محفوظ ہیں تو خود انہوں نے باہمی نزاعات پال لئے ہیں۔ دیو بندی بریلوی جھگڑا کلکتے میں بہت پھیلا ہوا ہے وگرنہ جہاں تک ہندو مسلم فسادات کا تعلق ہے ان سے بنگال کی فضا زیادہ آشنا نہیں 'شاید ایک وجہ یہ بھی ہو کہ کمیونسٹ زیادہ سیکولر ذہن رکھتے ہیں اور ان کی انتظامیہ اس طرح کے واقعات کو برداشت کرنے کے لئے تیار نہیں 'لاء اینڈ آرڈر کی مجموعی صورتحال بھی دوسرے صوبوں کی نسبت بہتر ہے اور یہی سبب ہے کہ حالیہ انتخابات میں کمیونسٹ پارٹی پہلے سے بھی بڑھ کر کامیاب ہوئی ہے 'انتخابی نتائج پر نگاہ ڈالی جائے تو نظر آئے گا کہ اب کے کانگریسی اکثریت کے علاقوں میں جنتادل کے امیدوار جیتے ہیں اور غیر کانگریسی علاقوں میں کانگریس کے نمائندے مگر بنگال میں کمیونسٹوں کی حکومت تھی اور یہاں اس مرتبہ بھی رائے عامہ نے انہی کے حق میں ووٹ دیا ہے۔ لوک سبھا میں تو اس مرتبہ یہاں سے ان کے ممبروں کی تعداد پہلے سے بھی زیادہ ہے۔

جماعت اسلامی بنگال کے ایک رُکن رکین اور ہفت روزہ 'انقلاب' کے ایڈیٹر جناب عبدالعزیز نے بھی قدم رنجہ فرمایا وہ نوجوان ہیں اور مسلمانانِ بھارت کو سماج اور حکومت میں ان کا قرار واقعی مقام دلانے کے لئے بے قرار ہیں 'بھارت کی جماعت اسلامی پاکستان کی جماعت سے بڑی حد تک مختلف ہے وہ پچھلے الیکشنوں تک خالصتاً غیر سیاسی جماعت تھی اس کے نزدیک الیکشن میں حصہ لینا تو ایک طرف رہا ذاتی ووٹ کا استعمال بھی غیر اسلامی تھا مگر اس مرتبہ یہ تبدیلی آئی ہے کہ کم سے کم جماعت نے اچھے اُمیدواروں کے حق میں ووٹ دینے کو جائز قرار دیدیا ہے۔ اس میں بھی مسلم اور غیر مسلم امیدوار کا امتیاز نہیں جسے مسلمان ووٹر اپنے حقوق کے حصول کے لئے مؤثر اور مؤید سمجھیں اسے ووٹ دے سکتے ہیں۔ اس مقصد کے لئے سیاسی جماعتوں سے الحاق اور اتحاد و تعاون ابھی تک جماعت کے پروگرام سے خارج ہے۔

عبدالعزیز صاحب نے بتایا کہ اس وقت جماعت میں دو طبقے ہیں ایک وہ جو ووٹ استعمال کرنے کے اس فیصلے پر بھی شرح صدر نہیں رکھتا اور دوسرا وہ جو سیاست میں کھل کر حصہ لینا چاہتا ہے۔ مؤخرالذکر طبقے میں زیادہ تر نوجوان شامل ہیں اور عزیز صاحب کا کہنا تھا کہ وہ امیر جماعت اسلامی پاکستان قاضی حسین احمد سے بطورِ خاص متاثر ہیں۔ جماعت کے کئی اہم رہنما تو اسی کشمکش کی وجہ سے جماعتی امور سے الگ تھلگ ہو کر بیٹھ گئے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ جب جماعت مسلمانوں کے اجتماعی معاملات میں کھل کر حصہ لے گی تو وہ بھی گوشۂ خلوت سے باہر آ جائیں گے۔

مسلمانانِ بھارت کی بدقسمتی یہی ہے کہ سیاسی سطح پر انہیں سرے سے کوئی قیادت ہی میتسر نہیں۔ مولانا اسعد مدنی کی جمعیت علمائے ہند اور سلیمان سیٹھ کی مسلم لیگ کانگرس کے ساتھ ہیں۔ سلطان صلاح الدین اویسی کی مجلسِ اتحاد المسلمین کا دائرہ اثر آندھرا پردیش (حیدر آباد دکن) تک محدود ہے۔ سیّد شہاب الدین ذہین آدمی ہیں مگر اس دفعہ وہ اپنی بعض غلطیوں کی وجہ سے اپنی سیٹ بھی نہیں لے سکے۔ جماعت اسلامی چالیس سال میں ابھی تک ووٹ ڈالنے ہی کو جائز قرار دے سکی ہے۔ تبلیغی جماعت سیاست کو شجرِ ممنوعہ سمجھتی ہے۔ حضرت مولانا سیّد ابوالحسن علی ندوی علمی کاموں کے لئے وقف ہیں۔ اب یہ خلاء کون پُر کرے؟ جناب عبدالعزیز کی باتیں مجھ پر مستقبل کے وسوسوں اور اُمیدوں کے بہت سے دروازے کھول بھی رہی تھیں اور بند بھی کرتی جا رہی تھیں، میں کلکتہ سے مدراس کے لئے روانہ ہوا تو تمام وقت انہی خیالوں میں ڈوبا رہا۔

لطف، ستم، وفا، جفا، یاس و اُمید، قُرب و بُعد
عشق کی عمر کٹ گئی چند توہمات میں

جب ہم حیدر آباد دکن پہنچے

بھارت میں عالمی اردو کانفرنس کے بانی، اردو کمپیوٹر کے موجد اور ہندوستان میں پہلی دفعہ منعقد ہونے والی انٹرنیشنل رحمتہ اللعالمین کانفرنس کے آرگنائزر جناب علی صدیقی بڑی خوبیوں کے آدمی ہیں۔ بہت معمولی وسائل سے زندگی کے سفر کا آغاز کیا مگر آج اپنی شبانہ روز محنت کی وجہ سے ہندوستانی سماج میں ایک بلند مقام پر فائز ہیں۔ نہرو فیملی سے بہت قریب تھے۔ اندرا گاندھی سے تو ان کا ماں اور بیٹے کا رشتہ تھا، ایمرجنسی کے بعد فیملی پر جو دَورِ زوال آیا اس میں بھی علی صاحب نے وفاداری بشرطِ اُستواری کا اصول قائم رکھا، یہی وجہ ہے کہ اپنی ماں کے بعد راجیو گاندھی نے بھی انہیں ہمیشہ عزت دی اور اس عزت کو علی صدیقی نے ہمیشہ اردو زبان کے فروغ کا ذریعہ بنایا۔ "عالمی اردو مورچہ" کے نام سے ان کی تنظیم پورے ہندوستان میں اردو زبان کو اس کا جائز مقام دِلانے کے لئے سرگرمِ عمل ہے۔ "اردو مورچہ" کے نام سے ان کا ایک ہفت روزہ بھی دہلی سے شائع ہوتا ہے جس کی ادارت مشہور صحافی اور ادیب جناب شہریار عابدی کرتے ہیں اس مورچے میں بیٹھ کر وہ اردو دوست اُمیدواروں اور تنظیموں کے حق میں پروپیگنڈے کی گولہ باری کرتے اور اردو دشمن کمین گاہوں کو چُن چُن کر نشانہ بناتے ہیں۔ امیر المومنین سیدنا علی مرتضیٰؓ کے خاص طور پر شیدائی ہیں۔ بتاتے ہیں کہ اوائل زندگی میں جب وہ بہت سی مشکلات میں گھرے ہوئے تھے جناب امیرؓ نے خواب میں آکر ان کی رہنمائی کی تب سے نجف اشرف جاکر روضہ مرتضویؓ پر ہدیۂ عقیدت پیش کرنا ان کی زندگی کا معمول ہے۔ اسی نسبت سے سالِ آئندہ سے وہ بھارت میں "جشنِ

مولودِ کعبہ" کے زیرِ عنوان مولا علیؑ کے یومِ ولادت پر ایک سالانہ بین الاقوامی کانفرنس کی بھی داغ بیل ڈال رہے ہیں، مخلص آدمی ہیں اس لئے قدرتاً جذباتی بھی بہت ہیں، گھڑی میں ماشہ گھڑی میں تولہ ان کے مزاج کا وصفِ خاص ہے، اپنے قدوقامت، رنگت اور گرمیٔ گفتار سے حضرت شورش کاشمیری کی یاد دلاتے ہیں۔ بھارت میں ایک تو اپنے سراپا کی مشابہت اور علمی و ادبی حیثیت کے لحاظ سے لکھنؤ کے پروفیسر ملک زادہ منظور احمد جناب شورش کا نقش ثانی ہیں اور دوسرے ہمارے علی صدیقی اپنی سیمابی طبیعت اور ہر وقت کچھ نہ کچھ کرتے رہنے کے ساتھ ساتھ اپنی بلندوبالا شخصیت کی وجہ سے شورش مرحوم کا عکس ہیں۔ یہ دل بھی کیا چیز ہے دوستوں کے بچھڑنے کے بعد کہیں نہ کہیں اور کسی نہ کسی میں پھر بھی ان کی شبیہیں جھلکیاں دیکھتا رہتا ہے۔

جناب علی صدیقی حیدر آباد دکن کے رہنے والے ہیں، ان کا ایک پاؤں دہلی میں ہوتا ہے تو ایک حیدر آباد دکن میں، بین الاقوامی "رحمتہ اللعالمین کانفرنس" دہلی میں مجھ سے وعدہ لے لیا کہ میں اپنے سفرِ بھارت کے دوران حیدر آباد دکن بھی ضرور آؤں گا اور سچ پوچھئے تو مجھے بھی وہ سرزمین دیکھنے کا بے حد اشتیاق تھا جہاں صدیوں مسلم ثقافت کا ڈنکا بجتا رہا ہے اور جس کے اجتماعی وسائل ہمیشہ برصغیر کے تمام علماء و مصنفین اور شعراء ادباء کی سرپرستی کے لئے وقف رہے ہیں۔

میں بنگلور سے حیدر آباد دکن پہنچا تو ایئرپورٹ پر جناب علی صدیقی اپنے بہت سے دوستوں کے ہمراہ میرے استقبال کو موجود تھے۔ انہوں نے مجھے پھولوں سے لاد دیا، پریس رپورٹر اور فوٹو گرافر بھی آئے ہوئے تھے کچھ دیر ان سے بات چیت رہی اور پھر ہم اپنے ہوٹل پہنچ گئے، جب میں حیدر آباد پہنچا تو انتخابات کا موسم عروج پر تھا پورے شہر کو الیکشن کا بخار چڑھا ہوا تھا، یہاں کے وزیر اعلیٰ این ٹی راماراؤ علاقے ہی کے نہیں پورے بھارت کے لیڈر سمجھے جاتے ہیں اور وہ مرکز میں راجیو گاندھی کی جگہ لینے کے عزم کا برملا اظہار کر چکے ہیں۔ بنیادی طور پر فلم ایکٹر ہیں اور سیاست اور اقتدار کی مصروفیات کے باوجود اس شعبے سے انہوں نے اپنا تعلق ختم نہیں کیا، اکثر فلموں میں دیوتا کا رول ادا کیا ہے اس لئے یہاں کی خواتین خاص طور پر ان کی عقیدت مند ہیں۔ ادھر وہ پردۂ سکرین پر جلوہ گر ہوتے ہیں اُدھر ان پڑھ عورتیں ہاتھ جوڑ کر ان کی پوجا میں مشغول ہو جاتی ہیں۔ ان دنوں بھی وہ اپنی ایک ایسی ہی فلم بنانے میں تیزی سے مصروف ہیں ان کا خیال ہے اس فلم میں جب وہ حسبِ معمول دیوتا کے رول میں نظر آئیں گے تو ووٹروں کے مذہبی جذبات کو اپیل کر کے دوبارہ حکومت میں آجائیں گے۔ اس مرتبہ وہ صوبائی اور مرکزی دونوں سیٹوں پر لڑ رہے تھے تاکہ حالات سازگار ہوں تو وزیر اعظم بن جائیں ورنہ وزیر اعلیٰ کا منصب تو ان کا منتظر ہے ہی۔ پچھلے الیکشن میں اندرا گاندھی کے قتل کی وجہ سے پورے بھارت میں راجیو گاندھی کے حق میں "ہمدردی کی ایک لہر" دوڑی ہوئی تھی اور انہوں نے اپنے نانا جواہر لال نہرو اور اپنی ماں اندرا گاندھی سے بھی کہیں زیادہ سیٹیں حاصل کی تھیں مگر یہ علاقہ اس کے باوجود این ٹی راماراؤ کے سحر میں مبتلا رہا اور یہاں کانگریس کو شکستِ فاش

ہوئی مگر اب کے گڑ بڑ یہ ہوئی کہ راماراؤ کی پارٹی (تیلگو دیشم) کے لیڈروں اور ان کے اعزا و اقربا (خصوصاً داماد نے) دورانِ اقتدار رشوت اور بد دیانتی کے ایسے ایسے کارنامے انجام دیئے کہ لوگ "توبہ توبہ" کرا ٹھے ہیں' اس نفرت کا نتیجہ یہ نکلا کہ اب کے عوام نے اس "دیوتا" لیڈر کو بُری طرح ٹھکرا دیا ہے۔ لوک سبھا (قومی اسمبلی) کی 42 نشستوں میں سے صرف 2 اس کی پارٹی کے حصے میں آئی ہیں۔ 38 سیٹیں کانگریس نے جیتی ہیں اور ایک مجلسِ اتحاد المسلمین کے سربراہ سلطان صلاح الدین اویسی نے۔ ایک حلقے کا نتیجہ ابھی سامنے نہیں آیا اپنی مقبولیت کے گھمنڈ میں رامار اؤ نے صوبائی اسمبلی کا الیکشن بھی ساتھ ہی ساتھ کرانے کا فیصلہ کیا تھا۔

اس کی 294 نشستوں میں بھی صرف 71 پر اس کے امیدوار کامیاب ہو سکے ہیں۔ بہر حال کہنے کا مطلب یہ ہے کہ حیدر آباد دکن میں میرا زمانۂ ورود عین انتخابات کے عروج کا زمانہ تھا اس لئے میں نے احباب سے عرض کی کہ اس موقع پر میں عام تقریبات میں حصہ نہیں لے سکوں گا۔ پریس کلب میں مجھے حضرت مولانا ابو الکلام آزاد کی شخصیت اور فکر پر ایک لیکچر دینا تھا وہ بھی میں نے منسوخ کرا دیا کیونکہ قدرتاً اس کا فائدہ کانگریس کو پہنچتا اور میں خواہ مخواہ یہاں کی سیاست میں فریق بن جاتا' سیرت النبیؐ کے ایک جلسہ میں شرکت سے بھی معذرت کی جس میں الیکشن لڑنے والے بعض رہنما بھی تقریریں کرنے والے تھے اس طرح حیدر آباد دکن میں میرا قیام صرف بعض ملاقاتوں اور دعوتوں تک ہی محدود رہا۔

غیر منقسم ہندوستان میں حیدر آباد دکن مسلم ثقافت کا ایک اہم مرکز تھا اردو زبان کا یہاں طوطی بولتا تھا' جامعۂ عثمانیہ میں ہر مضمون اردو زبان میں پڑھایا جاتا تھا یہاں تک کہ ایم بی ایس کرنے والے ڈاکٹر بھی کورس اردو ہی میں کرتے تھے اردو کا ہر بڑا شاعر اور ادیب کسی نہ کسی انداز میں نظام حیدر آباد کے دربار سے وابستہ تھا۔ مولانا گرامی سے لیکر مولانا شبلی اور علامہ اقبالؒ تک اور فانی اور جوش سے لیکر ماہر القادری تک بھی اکابرین علم و ادب پر اس سرزمین کے احسانات ہیں۔ حضرت مولانا سید ابو الاعلیٰ مودودی اور ان کے بھائی مولانا ابو الخیر مودودی بھی ریاست کے دار الترجمہ میں کام کرتے رہے ہیں۔ تقسیم کے بعد ظاہر ہے اب اردو کا وہ چلن تو نہیں رہا کہ نہ وہ پہلی سرکاری زبان ہے نہ دوسری' کالجوں اور یونیورسٹیوں میں بھی وہ ذریعۂ تعلیم نہیں مگر اس کی چھاپ یہاں کے کلچر اور معاشرت پر ایسی گہری ہے کہ اسے کھُرچنے کی ہزار کوششوں کے باوجود اب تک اسے کھُرچا نہیں جا سکا اور اس کا واضح ثبوت یہاں کا مضبوط اردو پریس ہے' جو اب تک عوام میں اپنی جڑیں رکھتا ہے۔ یہاں کا سب سے بڑا اردو اخبار "سیاست" ہے' جو اس وقت بھی تقریباً پچاس ہزار اشاعت رکھتا ہے اور روزنامہ "جنگ" کی طرح کمپیوٹر پر شائع ہوتا ہے۔ دوسرا اخبار "رہنمائے دکن" ہے اور یہ بھی اپنی اشاعت اور حلقۂ اثر کے اعتبار سے خاصا ممتاز ہے۔ ہوٹل میں کچھ دیر ستانے کے بعد روزنامہ "سیاست" کے مدیر اعلیٰ جناب عابد علی خان سے ملنے کے لئے میں ان کے دفتر

پہنچا انہیں اس کی اطلاع تھی اس لئے وہ حیدر آباد دکن کی مٹھائیاں اپنی میز پر سجائے میرے انتظار میں تھے۔ عابد صاحب کی عمر ساٹھ سال کے لگ بھگ ہوگی اقتدار کے ایوانوں میں بھی اچھا خاصا اثر ورسوخ رکھتے ہیں 'اردو کے فروغ میں رات دن مصروفِ عمل ہیں۔ یہاں اردو کے سلسلے میں جتنی عالمی کانفرنسیں منعقد ہوتی ہیں ان کی سرپرستی میں دریغ نہیں کرتے۔ دو چار دن بعد یہاں اردو ادب میں طنز و مزاح کے موضوع پر ایک بہت بڑی کانفرنس منعقد ہونے والی ہے اس میں بھی مہمانِ خصوصی آپ ہیں (اس طرح کی ایک آدھ کانفرنس میں پاکستان کے مشہور مزاح گو شاعر سید ضمیر جعفری اور ممتاز فکاہیہ نگار عطاء الحق قاسمی بھی شرکت کر چکے ہیں) انہی دنوں پاکستان کی متحدہ حزبِ اختلاف نے وزیر اعظم بے نظیر کے خلاف عدم اعتماد کی تحریک پیش کی تھی۔ خان صاحب نے اپنے ٹیلی پرنٹر پر موصول ہونے والی تازہ ترین خبریں مجھے مطالعہ کے لئے پیش کیں 'وہ اپنے اخبار میں شائع ہونے والے تمام مضامین اور منظومات کا ایک جامع کیٹلاگ بنوا رہے ہیں جس سے معلوم ہو سکے گا کہ کس روز کس شاعر یا مضمون نگار کی کون سے تخلیق ان کے اخبار میں شائع ہوئی ہے۔" سیاست "جنگ" اور "زمیندار" کی طرح بہت پرانا اخبار ہے اس لئے تنہا یہی فہرست کئی جلدوں میں شائع ہوگی 'مجھے ان کا یہ اقدام بہت اچھا لگا بدقسمتی سے روزناموں میں چھپنے والی اکثر و بیشتر تحریروں کی عمر بہت مختصر ہوتی ہے حالانکہ ریسرچ کا کام کرنے والوں کے لئے ان کی اہمیت محتاجِ بیان نہیں۔ ہمارے ہاں اگر "جنگ" اور "نوائے وقت" بھی یہ کام کر سکیں تو ادب اور صحافت کی بڑی خدمت ہوگی۔ عابد علی خان صاحب نے "سیاست" میں چھپنے والے بعض اہم مضامین اور نظموں کے مجموعے بھی شائع کئے ہیں وہ بھی انہوں نے عطا کئے۔ خان صاحب میرے اعزاز میں ایک عشائیہ بھی ترتیب دے رہے ہیں اس لئے باقی باتیں اس وقت تک کے لئے ملتوی کر کے میں نے ان سے اجازت چاہی۔ رات کو حیدر آباد دکن کے ایک مشہور مطعم "پیلس ریسٹورنٹ" میں جناب وقار الدین قادری ایڈیٹر "راہنمائے دکن" نے میرے لئے ایک ڈنر ترتیب دیا جس میں پارلیمنٹ کے بعض ممبروں کے علاوہ جناب علی صدیقی اور کئی مقامی ادیب اور شاعر بھی شریک تھے۔ قادری صاحب اقلیتوں کے صوبائی کمیشن کے چیئرمین بھی ہیں اور ان کا شمار کانگریس کے زبردست ناقدین میں ہوتا ہے۔ ابھی نوجوان ہیں اور اپنی محنت سے اس مقام تک پہنچے ہیں خوشی ہوئی کہ دسترخوان پر تمام کھانے مخصوص حیدر آبادی ذائقہ لئے ہوئے تھے۔ یہاں کے اچار سے لیکر بینگنوں تک ہر ڈش کا اپنا ایک جداگانہ مزا اور برِّ صغیر کے کھانوں میں اپنی ایک الگ پہچان ہے۔ "پیلس ریسٹورنٹ" کی یہ طعام گاہ بہت بلندی پر واقع ہے اس لئے یہاں سے شہر کا منظر بہت خوبصورت دکھائی دیتا ہے 'میرِ محفل کہنے کو تو یہاں میں تھا مگر جہاں علی صدیقی ہوں وہاں کسی اور کی دال مشکل سے گلتی ہے وہ اپنی دبنگ اور پاٹ دار آواز اور نتائج سے بے خوف و بے پروا اسٹائل میں لب کشا ہوتے ہیں تو پھر کسی اور کو بولنے کی ضرورت نہیں پڑتی اور ضرورت پڑے بھی تو باری نہیں آتی۔ وہ ایک زمانے میں بمبئی کی فلمی صنعت سے بھی وابستہ رہ چکے ہیں اور انہوں نے کئی فلمیں بھی بنائی ہیں۔ لگتا ہے یہ

ڈائیلاگ انہوں نے اُسی دَور میں سیکھے ہیں۔

اگلی صبح سلطان صلاح الدین اویسی صدر مجلس اتحاد المسلمین کی طرف سے ناشتہ کی دعوت تھی' یہ وہی مجلسِ اتحاد المسلمین ہے جس کے بانی مشہور خطیب اور قائداعظمؒ کے رفیقِ خاص نواب بہادر یار جنگ تھے۔ بعد میں سیّد قاسم رضوی اس کے صدر بنے اور پھر یہ ذمہ داری سلطان صلاح الدین کے والد جناب عبدالواحد اویسی کے حصہ میں آئی۔ اب سلطان صلاح الدین اس کے صدر ہیں پچھلے الیکشن میں یہاں سے ممبر پارلیمنٹ منتخب ہوئے تھے اور اب کے پھر اُمیدوار ہیں (خدا کا شکر ہے کہ مجھے واپسی پر اطلاع ملی کہ اب کے بھی وہ بھاری اکثریت سے کامیاب ہوئے ہیں) سلطان صلاح الدین اویسی بہت سنجیدہ اور متین شخصیّت کے مالک ہیں مگر اپنے سکوت میں سمندر کا تموج چھپائے رکھتے ہیں۔ لیبیا میں منعقد ہونے والی عالمی اسلامی کانفرنس میں ان سے ملاقات ہوئی تو انہوں نے گیارہ اور بارہ ربیع الاول کی درمیانی رات میں مجلس کی طرف سے منعقد ہونے والے سالانہ جلسۂ سیرت میں خطاب کرنے کی دعوت دی میں نے وعدہ کر لیا مگر بعد میں پاکستان اور ہندوستان کی تاریخوں میں ایک دن کے فرق کی وجہ سے گڑبڑ ہو گئی۔ میرا خیال تھا کہ دہلی کی بین الاقوامی رحمتہ اللعالمین کانفرنس کے پہلے دن کی کارروائی اٹنڈ کر کے اسی شام حیدر آباد روانہ ہو جاؤں گا مگر جب میں ایک دن پہلے دہلی پہنچا تو معلوم ہوا آج ہی رات حیدر آباد میں جلسہ ہے ایک تو پہلے ہی ہمارا جہاز لیٹ تھا دوسرے ہوٹل پہنچ کر جب پروگرام کا علم ہوا تو حیدر آباد کے جہاز کی روانگی میں صرف ایک گھنٹہ باقی تھا اور اتنے وقت میں ٹکٹ حاصل کرنے اور ایئرپورٹ پہنچنے کے مراحل طے کرنا آسان نہ تھا۔ حیدر آباد سے منتظمین نے مجھ سے فون پر رابطہ کیا تو میں نے صورتحال بتائی۔ ان بے چاروں نے بے حد پبلسٹی کر رکھی تھی اور ویسے بھی یہ پہلا موقع تھا کہ مجلسِ اتحاد المسلمین کی اس سالانہ تقریب میں پاکستان کا کوئی مہمان شریک ہو رہا تھا۔ ان کا کہنا تھا کہ اب کے حاضری ریکارڈ توڑ ہو گی (اور بعد میں صلاح الدین صاحب نے بتایا کہ دو سے تین لاکھ کا مجمع اُمڈ آیا تھا) ان کا اصرار تھا کہ اگر میں آج نہیں آسکتا تو کم سے کم کل کے نعتیہ مشاعرہ ہی میں مہمانِ خصوصی کے طور پر شریک ہو جاؤں میں نے وعدہ کر لیا مگر مجھے یہ معلوم نہ تھا کہ اس دن دہلی میں جو بین الاقوامی نعتیہ مشاعرہ ہو رہا ہے اس میں بھی مہمانِ خصوصی میں ہوں۔ ظاہر ہے اس صورت میں مَیں حیدر آباد نہیں جاسکتا تھا سو اس سے جو بدمزگی پیدا ہونی تھی ہوئی۔ مجلس کے کارپردازوں کو غلط فہمی ہوئی کہ ہو نہ ہو علی صدیقی نے ڈنڈی ماری ہے جو کانگریس کے ہم نوا ہیں اور نہیں چاہتے کہ مجلسِ اتحاد المسلمین کی کسی تقریب میں شمولیت اختیار کی جائے۔ اب واقعات کے اس پس منظر میں جناب سلطان صلاح الدین اویسی کے ناشتے میں جا رہا تھا مگر یہ ان کی عالی ظرفی ہے کہ وہ شکایت کا کوئی لفظ زبان پر نہیں لائے۔ میری معذرت قبول کرتے ہوئے صرف اتنا وعدہ لیا کہ سالِ آئندہ میں ان کے جلسۂ سیرت میں ضرور شریک ہوں گا۔

مجلسِ اتحاد المسلمین نے آزادئ ہند اور قیامِ پاکستان میں بے مثال خدمات انجام دی ہیں۔

حیدر آباد دکن وہ واحد علاقہ تھا جہاں مجلس کے ہوتے قائد اعظمؒ نے مسلم لیگ قائم کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ وہ حیدر آباد دکن تشریف لائے تو مجلس ہی کے پلیٹ فارم سے انہوں نے خطاب کیا اور ناشتے کی میز پر بیٹھے ہوئے وہ میدان میری نگاہوں کے سامنے تھا جہاں قائد اعظمؒ نے ایک عظیم الشان جلسۂ عام میں تقریر فرمائی تھی (یہ وہی جگہ تھی جہاں مجلس اپنے سالانہ جلسہ ہائے سیرت منعقد کرتی ہے اور اس کے مرکزی دفاتر اور تعلیمی ادارے بھی یہیں واقع ہیں) اس وقت مجلس ایک میڈیکل کالج، ایک انجینئرنگ کالج اور ایک گرلز کالج چلا رہی ہے، ایک عظیم الشان رفاہی ہسپتال کا سنگِ بنیاد اسی بارہ ربیع الاول کو رکھا گیا ہے جس میں سات سو بیڈ ہوں گے، مجلس کی رضا کار تنظیم کی ایک زمانے میں بڑی دھوم تھی وہ اب موجود نہیں ہے مگر اس سے وابستہ پرانے لوگ اپنی عسکری تربیت کے ساتھ اب بھی مفادِ ملّت کی پاسبانی کے لئے سربکف ہیں۔ حیدر آباد میں ہندو مسلم فسادات بہت کم ہوتے ہیں اور اس میں ان پرانے رضا کاروں کی موجودگی کی ہیبت بھی کچھ کم اہم فیکٹر نہیں، مجلس صوبائی اور قومی الیکشنوں میں بھرپور حصہ لیتی ہے اس مرتبہ بھی لوک سبھا کی چھ سیٹوں پر اور صوبائی اسمبلی کی پچاس سیٹوں پر اس نے اپنے امیدوار کھڑے کئے ہیں (مجھے اب تک معلوم نہیں ہو سکا کہ صلاح الدین صاحب کے علاوہ مجلس کے اور کتنے امیدوار کامیاب ہو سکے ہیں) میں صلاح الدین صاحب کے کمرۂ خاص میں ان کے ساتھ بیٹھا تھا اور ابھی ساتھ کے کمرے میں دوسرے لوگ جمع ہو رہے تھے اور ناشتہ میز پر چنا جا رہا تھا کہ راجیو گاندھی نے سلطان صلاح الدین کو فون کیا وہ ایک دو دنوں میں حیدر آباد آ رہے تھے اور صلاح الدین صاحب اور مجلس کے ساتھ انتخابی مفاہمت چاہتے تھے۔ یہ سلطان صلاح الدین کی قائدانہ بصیرت ہے کہ مشکل ترین حالات میں بھی مجلس کا آزاد کردار اب تک محفوظ ہے۔

سلطان صلاح الدین کے نام کے ساتھ "اویسی" کی نسبت صاف بتاتی ہے کہ تصوّف سے متاثر ہیں، مجھے خود ہر شہر میں اللہ والوں کو ڈھونڈنے اور ان سے فیض پانے کی جستجو لگی رہتی ہے۔ ناشتہ میں حیدر آباد کی نہاری اور مکّے مدینے کی انواع واقسام کی کھجوریں کھا چکا تو عرض گزار ہُوا کہ یہ تو جسمانی ضیافت تھی کیا یہاں روحانی دعوت کا سامان بھی ہو سکتا ہے یہ بات تخلیہ میں ہو رہی تھی، کہنے لگے "میں اس اجتماع سے بغیر کچھ بتائے آپ کو ایک جگہ لئے چلتا ہُوں ان کو کھولنا آپ کا کام ہے ورنہ دنیاداری کی باتیں کر کے چلتا کر دیں گے" ہم کار میں بیٹھ کر بازار سے گزرتے اور مختلف محلوں اور گلیوں سے ہوتے ہوئے ایک قدیم وضع کی حویلی کے باہر آ کر رکے، یہ حضرت آغا محمد داؤد کی جائے رہائش تھی جو سلسلہ "ابو العلائیہ" کے بزرگ ہیں، اس سلسلہ کے بانی حضرت عبد العلا جہانگیر کے زمانے میں پنج ہزاری منصب پر فائز تھے سرکارِ رسالت مآبؐ کو خواب میں دیکھا دربار چھوڑ دیا اور فنائیت اختیار کر لی ان کا واقعہ مشہور ہے، کسی نے کہا منصور نے "انا الحق" کہہ کر کیا جرم کیا کہ ان کو اتنی بڑی سزا ملی فرمایا "منصور نے "انا" تو کہا تھا اس کا مطلب ہُوا ابھی ان کی "مَیں" نہ گئی تھی تو اس کے عوض انہیں سزا نہ ملتی تو اور کیا ہوتا؟" سلطان

صلاح الدین مجھے گاڑی میں بٹھا کر اندر اطلاع کرنے گئے تو ان کے صاحبزادے میری پیشوائی کے لئے باہر تشریف لے آئے، میں ان سے واقف تھا ان سے بھی طرابلس کی کانفرنس میں سلطان کے ساتھ ملاقات ہو چکی تھی ان کے دھیمے پن اور پُرکشش شخصیت سے متاثر تو میں اس وقت بھی بہت ہُوا تھا مگر یہ معلوم نہ تھا کہ وہ ایک بڑے باپ کے بیٹے بھی ہیں، نشست کا کمرہ صاف ستھرا اور سادگی اور نفاست کا آئینہ دار تھا ہم تھوڑی ہی دیر بیٹھے ہوں گے کہ حضرت بھی تشریف لے آئے۔ کرتے پاجامے اور ٹوپی میں ملبوس نہ دُبلے نہ بہت موٹے، سفید کھچڑی داڑھی، ہاتھ میں عصا، پاؤں میں دیسی جوتی، چہرے پر تبسم کھیلتا ہوا حیا آلود مست و مخمور آنکھیں، ایسا لگا جیسے نور کا ایک جھونکا آیا اور کمرے کی ایک ایک چیز روشن ہو گئی۔ عرض کی "سلطان صلاح الدین کے لئے دعا فرمایئے اللہ تعالیٰ انہیں کامیاب فرمائے"۔ آہستگی سے فرمایا "انشاء اللہ" بعد میں سلطان نے کہا "حضرت کا یہ ارشاد سن کر میرے دل کا بوجھ اُتر گیا اب مجھے یقیناً کامیابی ہوگی پچھلے الیکشنوں میں بھی حضرت نے ایسے ہی فرمایا تھا"۔

کچھ دیر سکوت رہا پھر فرمایا "آپ کے ہاں بھی تو آج اسمبلی میں کچھ ہو رہا ہے" حضرت کا ارشاد حزبِ اختلاف کی تحریکِ عدمِ اعتماد کی طرف تھا میں نے کہا "آپ کیا دیکھتے ہیں؟" فرمایا "انشاء اللہ پاکستان قائم رہے گا"۔ میں نے کہا "کیا موجودہ حکومت بھی قائم رہے گی؟" فرمایا "علماء تو وہاں مخالفت کر رہے ہیں" میں نے کہا "آپ کی رائے کیا ہے؟" فرمایا "کسی کی بھی حکومت ہو اللہ کرے پاکستان میں مستحکم حکومت ہو"۔ خدا جانے! کیوں میرے دل میں آیا جیسے تحریکِ عدمِ اعتماد ناکام ہو جائے گی کم سے کم حضرت کے ارشادات سے میں نے یہی نتیجہ اخذ کیا۔

دل اٹھنے کو نہیں چاہتا تھا مگر ہوٹل میں کچھ اصحاب کو ملاقات کا وقت دے رکھا تھا، عرض کیا "اگر اجازت ہو تو رات کو کھانے کے بعد دوبارہ حاضری دوں"۔ حضرت رضامند ہو گئے مگر افسوس کہ عابد علی خان ایڈیٹر "سعادت" کے عشائیہ میں مشاعرہ نے اتنا طُول کھینچا کہ رات ڈھل گئی پھر سلطان صلاح الدین کو بھی اس وقت کسی انتخابی جلسہ میں شریک ہونا تھا وہ اس ڈنر میں میری خاطر سے چلے تو آئے تھے مگر اب ان کی انتخابی مہم میں رکاوٹ ڈالنا مجھے سخت نامناسب لگا، دل پر پتھر رکھ کر سلطان صلاح الدین کو حضرت سے عفو طلبی کا وسیلہ بنایا دوبارہ نہ جا سکا مگر ایسا لگتا ہے جیسے دل حضرت کے آستانے پر چھوڑ آیا ہوں جب سے آیا ہوں کوئی دن ایسا نہیں گزرا جب حضرت کی یاد نہ آئی ہو۔

سلطان صلاح الدین کے ناشتے پر حیدر آباد دکن کے میئر میر ذوالفقار علی بھی مدعو تھے، یہ مجلسِ اتحاد المسلمین سے تعلق رکھتے ہیں اور چونکہ بلدیہ کے کونسلروں میں مجلس کے اراکین کی اکثریت تھی اس لئے اب کے مجلس ہی کا میئر چنا گیا ہے اس سے شہر میں مجلس کے اثر و رسوخ کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ میر ذوالفقار ہی کے ذمے تھا کہ وہ مجھے ہوٹل سے لیں اور پھر واپس بھی چھوڑ دیں۔ ان کی عمر اس وقت 27 سال ہے، اس لحاظ سے یہ دنیا کے سب سے کم عمر میئر ٹھہرے۔ مجھ سے پوچھ رہے تھے کہ پاکستان میں اس عمر کا کوئی

میسّر ہو گا میرے علم میں کوئی اتنا کم عمر میسّر نہ تھا میں نے نفی میں جواب دیا تو خوش ہوئے۔ میں نے کہا "کیوں نہیں آپ "گینیز بک آف ورلڈ ریکارڈ" کے مرتبین کو لکھتے انہیں دنیا کے سب سے نو عمر میسّر کی حیثیت میں آپ کو اپنے صفحات میں جگہ دینی چاہئے"۔

ذوالفقار صاحب کے ساتھ ہوٹل جاتے ہوئے رستے میں بڑی دلچسپ گفتگو رہی، کہنے لگے "آج بھارت اور پاکستان کے درمیان فیصلہ کُن کرکٹ میچ ہے پاکستان جیت گیا تو آپ شام کو حیدر آباد میں گھوم کر دیکھئے گا یہاں جشن کا سماں ہو گا، مٹھائیاں بٹیں گی اور دیگیں چڑھائی جائیں گی۔ اللہ! بھارت کے مسلمان ہمیں کس نظر سے دیکھتے ہیں اور ہم اپنی کارگزاری اور کارکردگی کے لحاظ سے کہاں کھڑے ہیں؟

رات کا کھانا مدیر "سیاست" جناب عابد علی خان کے ساتھ تھا۔ انہوں نے شہر کے عمائدین، صحافیوں، ادیبوں اور شاعروں کو بھی مدعو کر رکھا تھا۔ "راہنمائے دکن" اور یہاں کے مشہور انگریزی اخبار "دکن کرانیکل" کے ایڈیٹر بھی تشریف لائے اور اپنی تمام تر انتخابی مصروفیتوں کے باوجود سلطان صلاح الدین اویسی نے بھی زحمت فرمائی۔ بعض اعلیٰ حکام بھی شریکِ محفل تھے، عابد صاحب نے پہلے پُر تکلف کھانا کھلایا اور بعد میں ایک شعری نشست سجائی جس میں حیدر آباد کے ممتاز شاعروں نے اپنا کلام سنایا۔ لگتا ہے طنز و مزاح سے یہاں کے لوگوں کو خصوصی دلچسپی ہے۔ طنز و مزاح کانفرنس کا ذکر پہلے ہو چکا اس محفل میں بھی طنزیہ اور مزاحیہ آیٹم پیش ہوئے، آخر میں مجھے بھی اپنے اشعار سنانے پڑے۔ بھارت کے اس دورے میں تو میں اچھا خاصا "مشاعرہ باز" شاعر بن گیا ہوں۔ اگلی صبح پھر ناشتے کی ایک "پُر ہجوم تقریب" تھی۔ یہ جیلانی پیراک صاحب کا مظاہرۂ خلوص تھا۔ جیلانی صاحب ایک سرگرم اور فعال سماجی اور ادبی کارکن ہیں، کسی زمانے میں تیراکی کے مقابلوں میں حصہ لیا کرتے تھے اس لئے پیراک ان کے نام کا جزو بن گیا ہے۔ ہر سال دنیا بھر کے قاریوں کا ایک مقابلۂ حسن قرأت منعقد کرانا اور قرأت کی ورلڈ ٹرافی کا اجراء ان کی زندگی کا مقصد بن چکا ہے، میں جب وزیر مذہبی امور تھا تو مجھے بھی خط لکھ کر اس جانب متوجہ کیا تھا اب بھی اپنی حکومت کے علاوہ بہت سے مسلم سربراہانِ حکومت سے خط و کتابت کرتے رہتے ہیں ایک لمبا چوڑا خط بہت سے اخباری تراشوں کے ساتھ صدر غلام اسحٰق خان کو بھی ارسال کیا ہے۔ ان کی خواہش ہے کہ میں اس تحریک کا سرپرست بنوں اور ان کے اس دیرینہ خواب کو شرمندۂ تعبیر کرنے میں ان کی مدد کروں اب میں انہیں کیا بتاؤں کہ اب اِدھر عمر بھر کی جدّ و جہد کے بعد ع مضمحل ہو گئے قویٰ غالب...... والا معاملہ ہے۔ بہرحال کچھ باہمت لوگ آگے بڑھیں اور اس مشن کو پایۂ تکمیل تک پہنچائیں تو یہ ایک بڑا کارنامہ ہو گا۔

جیلانی صاحب کا یہ ناشتہ "ایلڈرز کلب" (مجلسِ بزرگان) حیدر آباد کے زیر اہتمام شہر کے سب سے قدیم کلب "نظام کلب" میں "منعقد" ہوا۔ منعقد میں نے اس لئے کہا ہے کہ یہ ناشتہ بھی کسی جلسے سے کم نہ تھا ہر شعبۂ زندگی کے نمائندہ اصحاب افسر، جج، ماہرینِ تعلیم، ادیب اور شاعر، ڈاکٹر اور حکیم، مسلم

اور غیر مسلم بھی طبقات کی یہاں نمائندگی تھی۔ جامعہ عثمانیہ کے وائس چانسلر بھی تشریف فرما تھے اور یہاں کے شہرۂ آفاق دائرۂ معارف کے ڈائریکٹر بھی۔

حیدرآبادی ناشتہ کا اپنا ایک مینو ہے' قیمہ' کھچڑی' حیدر آبادی پراٹھے اور اچار اور بعدازاں چائے' ناشتہ کیا تھا ٹھیک ٹھاک لنچ تھا اس کے بعد دوپہر کے کھانے کی ضرورت ہی کہاں پڑتی ہوگی۔ ناشتہ کے بعد جیلانی صاحب نے استقبالیہ کلمات کہے اور پھر مجھے دعوت خطاب دی میں نے کوئی آدھ گھنٹہ تقریر کی ہوگی اس کا بھی خیال رہا کہ ورکنگ ڈے ہے لوگوں کو صبح صبح اپنے کام کاج پر جانا ہوگا مگر یہ ان حضرات کا کرم تھا کہ تقریر کے بعد اس کے اختصار کا شکوہ کرتے رہے۔ محفل میں "سلطان العلوم ایجوکیشنل ٹرسٹ" کے عہدیداران جناب امجد علی خان اور غلام محمد صاحب بھی آئے ہوئے تھے۔ یہ دونوں ریٹائرڈ آئی ایس ہیں (ہمارے ہاں کے سی ایس پی افسران کے بالمقابل آئی ایس انڈین سروس کا مخفف ہے) غلام محمد صاحب ہمارے پرانے دوست جناب علی رؤف (سابق ایس ایس پی لاہور) اور محمد یوسف صاحب سابق سیکرٹری وزارتِ مذہبی اُمور کے قریبی عزیز ہیں اور وہ ان حضرات سے میرے دوستانہ روابط کو جانتے تھے۔

ان حضرات کا بے حد اصرار تھا کہ میں ان کے ساتھ ان کے ٹرسٹ کے زیر اہتمام چلنے والے تعلیمی اداروں کا معائنہ کروں' میں اس "بھاری بھرکم" ناشتے کے بعد کچھ دیر آرام کرنے کے موڈ میں تھا (کہ اب ایک مدت سے اس طرح کا کوئی ناشتہ کرنا میری ہمت سے باہر ہے) مگر ان حضرات کے خلوص کے آگے ہتھیار ڈالنے پڑے اور ہم ان اداروں کو ایک نظر دیکھنے کے لئے چل کھڑے ہوئے۔

بھارت کے مسلمان تعلیمی اور رفاہی میدانوں میں جو پیش قدمی کر رہے ہیں اس کا ذکر میرے سفرنامے کی مختلف قسطوں میں قارئین کی نظر سے گزر رہا ہوگا۔ حقیقت یہ ہے کہ ہم پاکستانی مسلمان اس سلسلے میں ان سے کہیں پیچھے ہیں ہم لے دے کر ایک انجمنِ حمایت اسلام لاہور کو لئے بیٹھے ہیں اور وہ بھی اب ایک منجمد تنظیم ہے اس میں نمو اور ترقی تو کیا ہوتی انحطاط ضرور ہوا ہے، ہم سے تو ٹھیک طرح اس کی مجاوری بھی نہیں ہو پا رہی مگر بھارت کے مسلمان ہر علاقے میں ایسے کتنے ہی ادارے چلا رہے ہیں جن کے پائے کا پرائیویٹ تو کیا ہمارے ہاں کوئی سرکاری ادارہ بھی نہ ہوگا۔ حیدر آباد دکن کے اسی "سلطان العلوم ٹرسٹ" کو لیجئے یہ اس وقت ایک کالج آف ایجوکیشن' ایک انجینئرنگ کالج اور ایک لاء کالج چلا رہا ہے۔ گورنمنٹ سے ایک پیسہ کی گرانٹ لئے بغیر' بیس ایکڑ زمین پر ٹرسٹ نے خود کالجوں کی عالیشان عمارتیں تعمیر کی ہیں۔ ہوسٹل ان کے علاوہ ہیں ان کی تعمیر اور زمین کے حصول پر چار کروڑ روپے خرچ ہوئے ہیں۔ 1980ء سے پہلے جب یہ کالج قائم نہ ہوئے تھے۔ ریاست کے تمام انجینئرنگ کالجوں میں صرف بیس مسلم طلبہ تھے۔ اب تنہا ٹرسٹ کے انجینئرنگ کالج میں آٹھ سو مسلم طلبہ زیر تعلیم ہیں۔ ٹرسٹ کی کچھ مدد "نظام چیریٹیبل ٹرسٹ" نے کی ہے، جو مرحوم نظام نے اپنی زندگی میں 1954ء میں دو کروڑ روپے سے قائم کیا تھا اور اس میں اس وقت گیارہ کروڑ روپے ہیں۔ یہ ٹرسٹ نادار طلبہ اور تعلیمی و رفاہی اداروں کی

مدد کرتا ہے۔ باقی تمام عطیات حیدر آباد دکن کے مسلمانوں نے دیئے ہیں۔ پاکستان کے مسلمان اپنے دلوں کو ٹٹول کر دیکھیں، ہے کوئی یہاں ایسی تنظیم جو چار کروڑ روپے ملّت کے نونہالوں کی تعلیم کے لئے جمع کر سکے؟۔

میں نے سالار جنگ کا میوزیم بھی دیکھا مگر اس کا حال سنانے سے پہلے حیدر آباد دکن کے حکمرانوں کا کچھ تذکرہ ہو جائے کہ اس کے بغیر اس میوزیم کے قیام کی بات ادھوری رہے گی۔

حیدر آباد دکن کے حکمرانوں کو ریاست کے مُوسس کے نام پر "آصف جاہی نظام" کہا جاتا ہے۔ انہوں نے سات پشتوں تک یہاں دادِ حکومت دی ہے اور ان سات پشتوں کے پیچھے بھی ایک فقیر کی کرامت چھپی ہوئی ہے۔ کہتے ہیں کہ آصف جاہ اوّل ایک مرتبہ اپنے لشکر سے بچھڑ گیا اور اس دوران میں اسے بھوک نے بہت ستایا۔ رستے میں ایک فقیر کی کٹیا تھی وہاں پہنچا، فقیر نے اسے کلچے کے چند ٹکڑے دیئے، آصف جاہ نے تین کھا کر ہاتھ کھینچ لیا۔ فقیر نے مزید کھانے کے لئے اصرار کیا وہ جانتا تھا کہ مسافر بھوکا ہے شرم کے مارے کھانے سے احتراز کر رہا ہے۔ آصف جاہ نے چار ٹکڑے اور کھائے اس پر فقیر نے اسے دعا دی "جاؤ بیٹا! تمہاری حکومت سات پشتوں تک برقرار رہے گی"۔ ایک مردِ خدا کی زبان سے نکلے ہوئے یہ کلمات پورے ہوئے۔ آصف جاہی خاندان سات پشتوں تک ریاست حیدر آباد دکن کا حکمران رہا اور اس خاندان نے بھی فقیر کے اُن دعائیہ کلمات کو یہ اہمیت دی کہ کلچے کے نشان کو ریاست کے جھنڈے پر ثبت کر دیا۔

حیدر آباد دکن کی ریاست میں برار کا علاقہ بھی شامل تھا اور اس طرح یہ کوئی بیاسی ہزار سات سو مربع میل علاقے پر پھیلی ہوئی تھی۔ 1947ء تک اس کی آبادی ایک کروڑ ستر لاکھ افراد پر مشتمل تھی۔ آخری نظام میر عثمان علی خان تھے جو خود بھی شاعر تھے اور دوسرے علوم وفنون کے ساتھ ساتھ شعروادب کی بھی سرپرستی کرتے تھے۔ نظامِ ہفتم کے دولت جمع کرنے کے یوں تو بہت سے طریقے تھے لیکن ایک طریقہ بڑا اچھوتا تھا وہ ہر سال اپنی ریاست کے بہت سے لوگوں کو القاب وخطابات سے سرفراز فرمایا کرتے تھے۔ نواب، امیر، خان بہادر، دولہ، جنگ، ملک، جاہ کتنے ہی ٹائٹل تھے جو نظام کی طرف سے ریاست کے خواص کو عطا ہوتے اور جب ان کے اعلان کے لئے تقریب کا انعقاد ہوتا تو یہ سب اس کے عوض نظام کو سونے اور چاندی کے سکّوں کی صورت میں نذرانے پیش کرتے، ان نذرانوں کے بکسوں کے بکس نظام کے محل میں منتقل ہوتے رہتے اور ان میں برابر اضافہ ہوتا رہتا۔ نظام کو ہیرے جواہرات اور قیمتی پتھر جمع کرنے کا بھی بے حد شوق تھا۔ لندن کے زمانۂ قیام میں ایک مرتبہ ایک نامور برطانوی جوہری پچیس پچیس کیرٹ کے دو یاقوت لیکر آیا وہ انہیں نظام کے ہاتھ فروخت کرنا چاہتا تھا اس کا خیال تھا نظام یہ نادر لعل دیکھ کر حیران ہو جائے گا اور اسے منہ مانگے دام مل جائیں گے۔ نظام نے یہ یاقوت دیکھے تو اپنے پیش کار کو لوہے کا ایک صندوق لانے کا حکم دیا، صندوق کھلا تو اس میں چھوٹی چھوٹی تھیلیاں رکھی ہوئی تھیں۔ نظام نے ایک تھیلی کھولی تو اس سے دو درجن یاقوت برآمد ہوئے جن کے سائز کے مقابلے میں جوہری کے یاقوت ذرّوں

کی مانند نظر آتے تھے، نظام نے بعض دوسری تھیلیاں کھولیں تو ان سے بڑے بڑے ہیرے، زمرد اور دوسرے قیمتی پتھر نکلے۔ نظام نے مبہوت جوہری سے پوچھا "تمہارا کیا اندازہ ہے ان کی کیا قیمت ہوگی؟"۔ مگر وہ غریب کیا جواب دیتا وہ اس سوال سے پہلے ہی بے ہوش ہو چکا تھا اور یہ تو ایک صندوق تھا نظام کے محلاّت اس طرح کے لاتعداد صندوقوں سے بھرے ہوئے تھے۔ برطانیہ کو جنگِ عظیم میں نظام نے 2ء5 ملین پونڈ کی مالی امداد دی تھی۔ (واضح رہے کہ ایک ملین دس لاکھ کا ہوتا ہے اور آج کل ایک پونڈ کی قیمت 36 روپے ہے)

میں نے حیدر آباد دکن پہنچنے سے پہلے نظام کی کنجوسی اور حبِّ مال کی لاتعداد کہانیاں پڑھ رکھی تھیں مگر جب یہاں پہنچا تو معلوم ہوا نظام غریب غرباء کی مدد پر خرچ بھی بہت کرتا تھا اس کے "صرفِ خاص" سے چودہ ہزار "خانہ زاد" پرورش پا رہے تھے جن میں مسلمان بیواؤں اور یتیموں کے علاوہ بہت سے نادار و بیمار اچھوت خاندان بھی شامل تھے۔ نظام کا انتقال 24 فروری 67ء کو ہوا تو اس سے پہلے وہ اپنی دولت سے 33 ٹرسٹ بنا چکے تھے جو ان کے وارثوں کے استعمال کے لئے تھے مگر دو کروڑ روپے کے سرمائے سے ایک خیراتی ٹرسٹ بھی قائم کیا جس سے غریب مگر لائق طلبہ کو وظائف دیئے جاتے ہیں مستحق افراد کا علاج ہوتا ہے اور رفاہی اداروں کی امداد کی جاتی ہے۔

یہ تو نظام کی دولت و ثروت کی ایک جھلک تھی وہ تو پھر اپنی ریاست کے سفید و سیاہ کا مالک تھا اس کے وزراء کے وسائل کا اندازہ لگانا ہو تو حیدر آباد میں سالار جنگ کا میوزیم دیکھئے جو نظام کے وزیر اعظم تھے۔

یہ میوزیم 45 ہزار نادر و نایاب عجائب و غرائب پر مشتمل ہے اور اس کی مالیت کئی ارب روپے ہے۔ سالارِ جنگ تین پشتوں سے وزیر اعظم چلے آ رہے تھے ان کے باپ اور دادا بھی آصف جاہی خاندان میں وزارتِ عظمٰی کے منصب پر فائز تھے مگر چونکہ یہ کنوارے فوت ہوئے اور کوئی ان کا وارث نہ تھا اس لئے ان کی تمام اشیاء پر حکومتِ ہند نے قبضہ کر لیا ہے اور صرف اس کے تیسرے حصہ کو "سالار جنگ میوزیم" میں عام نمائش کے لئے رکھ دیا گیا ہے۔ میوزیم کو دیکھنے کیلئے کئی گھنٹے صرف ہوتے ہیں قالین، برتن، فرنیچر، پینٹنگز، ہتھیاروں، لباس، کتابوں اور سکوں سے لیکر قرآنی مخطوطات تک کون سی چیز ہے جو یہاں موجود نہیں۔ میں تو خیر صرف قرآن پاک کے قلمی نسخوں میں دلچسپی رکھتا تھا وہ شوق سے دیکھے مگر اپنے دوسرے ساتھیوں کی خاطر مجھے بعض دوسرے شعبوں میں بھی جانا پڑا۔ ایک ایک آئیٹم کو دیکھ کر عقل دنگ ہوتی ہے۔ انسان بھی کیا چیز ہے کیا کچھ جمع نہیں کرتا اسے ایسا کرتے ہوئے موت بھی یاد نہیں آتی، سمجھتا ہے ہمیشہ یہیں رہوں گا۔ میں میوزیم سے باہر نکلا تو ہمارے گائیڈ نے بتایا "جب ان سڑکوں سے حضور کا گزر ہوتا تھا تو پیسوں کی بارش ہوتی جاتی تھی"۔ مگر مجھ پر کچھ اور خیالات کی بارش ہو رہی تھی، میں اندر چوکھٹوں میں لگی بے شمار تصویروں کو دیکھ کر آیا تھا اس وقت مجھے ایک اور چوکھٹے کا خیال آ رہا تھا۔

قبر کے چوکھٹے خالی ہیں انہیں مت بھولو
جانے! کب کون سی تصویر سجا دی جائے
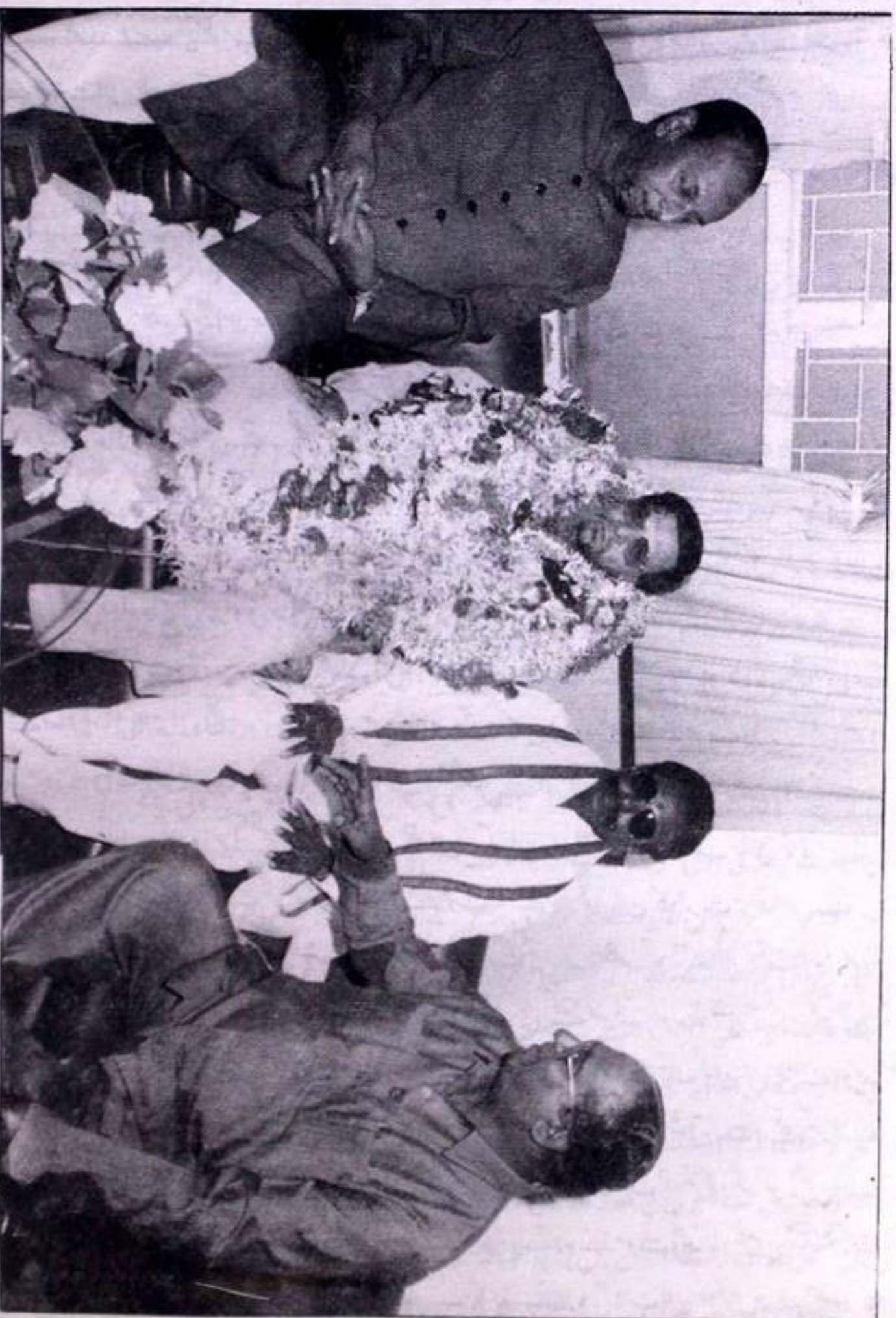
حیدر آباد دکن کے ہوائی اڈے پر (دائیں سے بائیں) جناب علی صدیقی۔ میئر حیدر آباد بلدیہ۔ مصنف، سلطان صلاح الدین اویسی

سلطان ٹیپو شہیدؒ کے مزار پر

میں ساتویں جماعت میں پڑھتا تھا کہ سکول کی لائبریری سے محمود خان بنگلوری (مرحوم) کی تالیف ''سلطنتِ خداداد'' نکلوا کر پڑھی، یہ سلطان ٹیپو شہیدؒ اور ریاست میسور پر اب تک لکھی جانے والی تمام کتابوں میں امتیازی مقام رکھتی ہے۔ اس وقت سے سلطان ٹیپو شہیدؒ کا نام حافظے میں ایسا پیوست ہُوا کہ وقت کی اُلٹ پھیر اب تک اسے محو نہیں کر سکی۔ خیال تھا کہ کبھی ہندوستان جانا ہوگا تو سلطان شہیدؒ کے مزار پر بھی حاضری دوں گا خدا کا شکر ہے کہ حالیہ سفرِ ہند میں اس کا موقع نکل آیا،

رحمت اللعالمین کانفرنس دہلی میں میسور کالج میں شعبۂ اردو کے سربراہ پروفیسر سید منظور احمد سے ملاقات ہوئی تو انہوں نے بڑے خلوص سے ''میسور'' آنے کی دعوت دی، پروفیسر صاحب ایک متشرع، مخلص اور عالم آدمی ہیں اردو ادب اور اسلامیات سے گہرا شغف رکھتے ہیں، ایک عرصے سے اس کوشش میں ہیں کہ میسور میں یومِ اقبال کی تقریب منعقد کریں اور اس میں فرزندِ اقبال جناب ڈاکٹر جسٹس جاوید اقبال کو مدعو کریں، جسٹس صاحب سے اس سلسلے میں خط و کتابت بھی کر چکے ہیں اور اب مجھ سے بھی خواہش کی کہ ان سے میسور آنے کی سفارش کروں، اصل میں میسور کے لوگ علآمہ اقبال سے سلطان ٹیپو شہید کے حوالے سے بھی خصوصی تعلق رکھتے ہیں، علآمہ اقبالؒ ایک زمانے میں میسور تشریف لے گئے تھے اور انہوں نے سلطان شہیدؒ کے مزار پر بھی حاضری دی تھی بعد میں اس حوالے سے ''جاوید نامہ'' میں حضرت علآمہؒ نے سلطان کے کام اور پیغام کے بارے میں جو اشعار کہے وہ بھی اب تک یہاں کے اہلِ علم

نے حرزِ جاں بنا رکھے ہیں چنانچہ جب میں میسور پہنچا تو اس سلسلے میں بہت سی تفصیلات میرے علم میں آئیں۔

سلطان کے جدِّ امجد شیخ ولی محمد مکّہ مکرمہ سے ہندوستان میں وارد ہوئے تھے' ان کے پوتے حیدر علی نے ریاست میسور کی فوج میں ملازمت اختیار کر لی اور فنونِ جنگ میں مہارت کی وجہ سے پہلے ریاست کے سپہ سالار اور بعد میں مرہٹوں کو شکست دینے کے بعد میسور کے حکمران ہو گئے۔ سلطان حیدر علی اَن پڑھ تھے مگر انہوں نے اپنے زمانۂ حکمرانی میں جو کارہائے نمایاں انجام دیئے وہ حیران کُن ہیں' برطانیہ اس دوران میں ہندوستان کے دوسرے علاقوں پر غلبہ پا چکا تھا اور وہ جنوبی ہند میں اس اُبھرتی ہوئی مضبوط حکومت سے سخت خائف تھا اس لئے اس نے مرہٹوں اور نظام حیدر آباد کے ساتھ مل کر دو مرتبہ ریاست میسور پر حملہ کیا مگر دونوں مرتبہ منہ کی کھائی اس موقع پر صلح کا جو معاہدہ ہُوا سلطان نے اس میں ایسٹ انڈیا کمپنی کو فریق بنانے کی بجائے انگلستان کے بادشاہ کو اپنا حریف بنایا اور معاہدۂ صلح پر دونوں کے دستخط ثبت ہوئے' شرائط صلح بھی سلطانِ حیدر علی کی مرضی کے مطابق طے ہوئیں اور اس طرح برطانیہ کی طرف سے پورے ہندوستان پر حکومت کرنے کا خواب 'خوابِ پریشان بن گیا۔

سلطان حیدر علی ابھی بادشاہ نہیں بنے تھے کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں فرزند عطا کیا' اس کا نام "فتح علی ٹیپو" رکھا گیا "ٹیپن" جنوبی ہندوستان کے ایک مشہور بزرگ تھے' کچھ لوگ کہتے ہیں کہ "ٹیپو" اسی سے ماخوذ ہے اور کچھ کہتے ہیں کہ "ٹیپو" کرناٹکی زبان میں (کرناٹک قدیم زمانے سے ریاست میسور کا نام چلا آرہا ہے) شیر کو کہتے ہیں۔ سلطان حیدر کو شیروں سے بہت لگاؤ تھا اور ویسے بھی ان کے بیٹے کو آگے چل کر شیر کی سی بہادری کا مظاہرہ کرنا تھا اس لئے اس کا نام ٹیپو رکھا گیا۔

ٹیپو چھ سات سال کے تھے کہ ایک دن سرنگاپٹم میں بچوں کے ساتھ کھیل رہے تھے (سرنگاپٹم ریاست میسور کا دارالحکومت تھا اور آج کل بھی کرناٹک کا مشہور شہر ہے) ان کے والد ان دنوں میسور کے راجہ کے زیرِ عتاب تھے ایک مجذوب چلتے چلتے اس گلی میں رُک گئے جہاں ننھا ٹیپو اپنے ہمجولیوں کے ساتھ کھیل رہا تھا' فرمایا "تمہارے ماتھے پر لکھا ہے کہ ایک دن تم اس سرزمین کے حکمران بنو گے جب وہ وقت آئے تو اِس مقام پر ایک مسجد بنانا نہ بھولنا" ننھے ٹیپو کو یہ بات یاد رہی سلطان بن کر اس نے "مسجد اعلیٰ" کے نام سے اسی مقام پر ایک عالی شان مسجد تعمیر کی' یہ مسجد آج بھی موجود ہے اور جب میں سرنگاپٹم پہنچا تو اس مسجد میں دو نفل ادا کرنے کی سعادت مجھے بھی حاصل ہوئی۔

سلطان حیدر علی نے اپنے فرزند کی تربیت کامل سپاہیانہ انداز میں کی' عربی' فارسی' انگریزی' فرانسیسی زبانوں کی تدریس کے ساتھ ساتھ فرانسیسی ماہرینِ حرب کی زیرِ نگرانی فنونِ جنگ کی بھی تعلیم دی گئی' باپ جانتا تھا کہ آنے والا زمانہ انگریزوں سے لڑتے گزرے گا اور میرے بیٹے کو خود فوجوں کی کمان کرنی پڑے گی اس لئے اسے ایک جرنیل حکمران ہونا چاہئے اور وقت نے ثابت کر دیا کہ سلطان حیدر علی کی یہ پیش بینی درست تھی ٹیپو بیس سال حکمران رہا مگر یہ سارا وقت اس نے اپنے باپ کی طرح جنگ کے میدانوں میں

گزار دیا یہ بھی عجیب اتفاق ہے کہ سلطان حیدر علی کی مدتِ حکومت بھی بیس سال تھی اور جب ان کا انتقال ہوا ہے تو وہ انگریزوں کے خلاف تیسری لڑائی لڑ رہے تھے اور جب 48 سال کی عمر میں ٹیپو اللہ کو پیارا ہوا ہے تو وہ بھی انگریزوں کے خلاف میدانِ جہاد میں ڈٹا ہوا تھا۔

سلطان حیدر علی کا انتقال ہوا تو انگریزوں کی سازشوں سے میسور میں ہر طرف شورش اُٹھ کھڑی ہوئی کئی علاقوں میں بغاوت ہو گئی' انگریز پہلے ہی سے اس کے باپ کے ساتھ ہونے والے معاہدۂ صلح کی دھجیاں بکھیر کر میدانِ جنگ میں اس کا سامنا کر رہے تھے' سلطان شہید نے ایک ایک کر کے ان ریشہ دوانیوں کا خاتمہ کیا انگریزوں کو پھر ایک بار شکستِ فاش کا سامنا کرنا پڑا اور ایک نئے معاہدہ کی رو سے انہیں سلطان ٹیپو کو اپنے باپ کی مملوکہ تمام ریاست کا واحد حکمران تسلیم کرنا پڑا۔

''تقسیم کرو اور حکومت کرو'' انگریزوں کا مشہور طریقِ کار ہے۔ سلطان ٹیپو کے معاملے میں بھی وہ اس پر کاربند رہے' نظام حیدر آباد اور مرہٹے. جنوبی ہند میں سلطان ٹیپو کے ساتھ رہتے تو ہند میں برطانوی سامراج کا سورج کبھی طلوع نہ ہوتا مگر انگریزوں نے نفاق کے ایسے بیج بوئے کہ نظام اور مرہٹوں کو ٹیپو کے مقابلے میں اپنا حلیف بنا لیا' سلطان ٹیپو شہید نے اس موقع پر نظام حیدر آباد کو جو خط لکھا اس کی ایک ایک سطر سے ان کی دلسوزی اور دردمندی کا اظہار ہوتا ہے۔ انہوں نے نظام کو لکھا:-

> ''میری زندگی کا ایک ہی مقصد ہے کہ میں اسلام کو اس خطّے میں سربلند دیکھوں اور میں اس سلسلے میں ہر قربانی دینے کو تیار ہوں' ایک مسلم حکمران ہونے کی حیثیت سے آپ کا فرض ہے کہ آپ میرے ہاتھ مضبوط کریں چہ جائیکہ مرہٹوں کا ساتھ دیں جو مسجدیں مسمار کرتے اور بزرگانِ دین کے مزاروں کو منہدم کرتے ہیں لیکن کاش' آپ کو معلوم ہوتا کہ اگر ہم دونوں متحد ہو جائیں تو نہ انگریز ہمارا کچھ بگاڑ سکتے ہیں نہ مرہٹے' میں اس اتحاد کے لئے آپ کے بیٹوں کے ساتھ اپنی بیٹیاں بیاہنے کے لئے تیار ہوں' اس مظاہرۂ اُخوت سے دشمنانِ اسلام میں ثابت ہو جائے گا کہ جنوبی ہند کی دونوں مسلم طاقتیں ایک ہو چکی ہیں اور اس طرح ان کے عزائم خاک میں مل کر رہ جائیں گے''

مؤرخین لکھتے ہیں کہ سلطان شہیدؒ کے اس مکتوب کا نظام پر بہت اثر ہوا مگر فرنگی نے اس کے دربار میں اپنے جو مہرے فٹ کر رکھے تھے وہ حرکت میں آ گئے اور انہوں نے نظام اور اس کے خاندان کی خواتین کو اس رشتے ناطے سے باز رکھا' ان کی دلیل یہ تھی کہ سلطان کے آباؤ اجداد باہر سے یہاں آ کر آباد ہوئے ہیں ان کے خاندان سے نظام کی قرابت داری ایسے ہو گی جیسے ریشم میں ٹاٹ کا پیوند لگا دیا جائے' فرنگی ایجنٹوں کی اس مہم کا خاطر خواہ نتیجہ نکلا اور یہ دونوں مسلمان طاقتیں ایک نہ ہو سکیں' جلد ہی مرہٹے اور نظام شاہی کی متحدہ افواج سے ٹیپو کی جنگ چھڑ گئی جو چار سال جاری رہی اور سلطان اس میں ایک بار پھر ظفرمند اور

فتح یاب ہوئے' اب انگریز ٹیپو کی ذات میں ایک خطرناک حریف دیکھ رہے تھے چنانچہ انہوں نے سازشوں کا جال پھیلا دیا' سلطان کے قریبی لوگوں کو خریدنے کے علاوہ وہ سلطان پر کاری ضرب لگانے کے لئے موقع کا انتظار کرنے لگے' انہوں نے کوچین اور ٹراونکور کے راجوں سے سلطان کے خلاف بغاوت کرا دی اور جب سلطان کی فوجیں اسے فرو کرنے کے لئے حرکت میں آئیں تو وہ یہ کہہ کر خود بھی میدانِ جنگ میں کود پڑے کہ ٹراونکور مدراس کی سرحد پر واقع ہے جو انگریزوں کے زیرِ نگین ہے اس لئے وہ خاموش تماشائی نہیں رہ سکتے'

اس وقت سلطان اور انگریزوں کے درمیان صلح کا معاہدہ تھا مگر انہوں نے اس کی بھی پرواہ نہیں کی' جنوبی ہند میں فرانس کی بھی نو آبادیاں تھیں' ٹیپو نے فرانسیسی گورنر سے مدد مانگی اور وعدہ کیا کہ انگریزوں کو جنوبی ہند سے مار بھگانے کے بعد مفتوحہ علاقے فرانس کو دے دیئے جائیں گے مگر فرانس کا بادشاہ اس زمانے میں اپنے داخلی مسائل میں اُلجھا ہوا تھا وہ اس پیشکش کو قبول نہ کر سکا اور اس طرح برطانیہ کو ہندوستان سے نکال باہر کرنے کا یہ آخری موقعہ بھی ہاتھ سے نکل گیا' برطانیہ' مرہٹے اور نظام تینوں متحد ہو کر ٹیپو کے بالمقابل آ گئے ان کی فوج لاکھوں پر مشتمل تھی جبکہ سلطان کا لشکر صرف چالیس ہزار سپاہیوں پر مشتمل تھا' بنگلور کا کمانڈر کرشن راؤ دشمن کے ہاتھوں بک گیا اور کسی جنگ کے بغیر بنگلور کو فتح کرنے کے بعد انگریزوں نے سرنگاپٹم کا محاصرہ کر لیا۔ محاصرہ نے طول کھینچا اور ٹیپو کی فوجوں نے قلعہ سے نکل کر حملہ آوروں کو کئی میل پیچھے دھکیل دیا تو انگریزوں نے تازہ دم ہونے کے لئے پھر صلح کا جال پھینکا' انہوں نے ٹیپو سے تین کروڑ روپے تاوان کا مطالبہ کیا' طے پایا کہ جب تک یہ تاوان ادا نہیں ہوتا سلطان کے دو صاحبزادے بطور یرغمال ان کے قبضے میں رہیں گے۔ 1796ء میں شاہزادے واپس آ گئے تو سلطان نے پھر سے جہاد کی تیاریاں شروع کیں۔ اس مرتبہ انہوں نے افغانستان' ایران' ترکی' فرانس اور کئی ہندوستانی حکمرانوں کے پاس اپنے سفیر روانہ کئے ان سفیروں نے 1798ء میں واپس آ کر سلطان کو مسلمان بادشاہوں کے مایوس کن جواب سے آگاہ کیا' صرف افغانستان کا جواب حوصلہ افزا تھا یا پھر فرانس کا جس نے اپنے دو سو فوجی ماہرین سلطان کی افواج کو تربیت دینے کے لئے روانہ کئے۔ افغانستان کو سلطان کی مدد سے باز رکھنے کے لئے برطانیہ نے اپنی سازشوں سے ایران اور افغانستان کو باہمی جنگ میں اُلجھا دیا۔ سلطان کا وزیر اعظم میر صادق اور ان کا وزیر خزانہ پورانیہ درپردہ انگریزوں سے ملے ہوئے تھے انہوں نے انگریزوں کی نقل و حرکت سے سلطان کو بے خبر رکھا تا آنکہ انگریزوں نے 22 فروری 1799ء کو میسور پر حملہ کر دیا' 4 مئی کو محاصرہ کے دوران سلطان کو اطلاع ملی کہ ان کا وفادار جرنیل سیّد غفار دشمنوں سے لڑتے ہوئے شہید ہو گیا ہے وہ خود شمشیر بکف قلعہ کی بیرونی دیوار پر دشمنوں کا مقابلہ کرنے کے لئے نکل آئے ایسے میں وزیر خزانہ پورانیہ نے چال چلی اس نے لڑتے ہوئے سپاہیوں کو اطلاع کرا دی کہ خزانے سے تنخواہ دی جا رہی ہے' سپاہی اپنی تنخواہ لینے دوڑے غدّاروں نے ادھر برطانوی لشکر کو اطلاع کر دی' سلطان اپنے

مٹھی بھر رفیقوں کے ساتھ دادِ شجاعت دے رہے تھے دشمنوں نے ہر چار طرف سے انہیں نرغے میں لینا شروع کیا وہ پیچھے پلٹے کہ اندرونی دیوار کے دروازے سے قلعہ میں واپس پہنچ جائیں مگر میر صادق کی غدّاری سے یہ دروازہ بند ہو چکا تھا' ایسے میں ان کے بعض ساتھیوں نے انہیں ہتھیار ڈالنے اور اپنی جان بچانے کا مشورہ دیا' اس پر سلطان نے جو جواب دیا وہ ہماری تاریخِ آزادی میں سرِ عنوان بن کر چمک رہا ہے۔ سلطان نے کہا:-

"شیر کی زندگی کا ایک دن بھیڑ (یا گیدڑ؟) کی زندگی کے سو سال سے بہتر ہے"

یہ کہا اور تلوار سونت کر دشمن پر ٹوٹ پڑے' گھمسان کا رَن پڑا' ایک ایک جاں نثار آپ پر قربان ہو گیا' حرم سے کتنی ہی خواتین باہر نکل آئیں اور وہ بھی دشمن سے لڑتے ہوئے شہید ہو گئیں' سلطان کا گھوڑا مارا گیا اور رات گئے سلطان بھی دل کے قریب گولی لگنے سے جاں بحق ہو گئے۔

اقبالؒ نے جاوید نامہ میں اُن غدّارانِ ازلی کا حال بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ دوزخ نے بھی اُن ارواحِ رذیلہ کو قبول کرنے سے انکار کر دیا وہ کہتے ہیں ہندوستان میں غلامی کی تخم ریزی در حقیقت اُنہی ارواحِ خبیثہ نے کی ہے اگر وہ غداری نہ کرتیں تو انگریز کبھی کامیاب نہ ہوتے۔

در گلشن تخمِ غلامی را کہ کِشت ؟
ایں ہمہ کردار آں ارواحِ زِشت

....

ہم صبح آٹھ بجے کار کے ذریعے بنگلور سے میسور روانہ ہوئے' واقعی کرناٹک خطّۂ خداداد ہے موسم کے اعتبار سے بھی یہ پورے ہندوستان سے مختلف ہے' گرمیوں اور سردیوں کا موسم یہاں کسی نے دیکھا ہی نہیں' ہر وقت بہار کا موسم رہتا ہے' جدھر دیکھو سبزہ ہی سبزہ' پھول ہی پھول' یہی وجہ ہے کہ بھارت کے تمام بڑے لوگ' رہنے والے جہاں کے بھی ہوں' ایک گھر یہاں ضرور رکھتے ہیں میں نے زندگی میں بہت سے طویل سفر کار کے ذریعے کئے ہیں ایک سفر جو کبھی نہیں بھولے گا' بیروت سے دمشق کا ہے اور دوسرا بنگلور سے میسور تک کا' زندگی رہی تو بیروت سے دمشق تک کی کہانی پھر کبھی سناؤں گا' اس وقت بات کرناٹک کی ہو رہی ہے یوں سمجھئے کہ آپ میسور کی طرف کیا جا رہے ہیں جنّتِ ارضی میں گُل گشت کر رہے ہیں' ایک انچ جگہ نہ ہو گی جو سبزے اور پھولوں سے خالی ہو' خوبصورت گھنے درختوں کی چھاؤں دل میں ٹھنڈک ڈالتی چلی جاتی ہے جگہ جگہ آبِ رواں موجیں مار رہا ہے' ناریل کے درخت جنّتِ نگاہ کا بھی سامان ہیں اور کام و دہن کی تواضع کا قدرتی دسترخوان بھی' ہم جگہ جگہ رُکتے' ناریل کا تازہ پانی پیتے اور اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا شکر بجالاتے' طویل سفر سے مجھے فلو ہو گیا تھا اور پیٹ بھی ٹھیک نہ تھا۔ ڈاکٹر نے کہا تھا کہ ہر علاقہ میں آب و ہوا کے اختلاف سے یہ عوارض پیدا ہوتے رہتے ہیں سو تم کوئی دوا نہ کھاؤ اور نہ کسی جگہ کا پانی پیو صرف ناریل کا پانی پیتے رہو اور اس کی کریم نکال کر کھاتے رہو تندرست رہو گے۔ سو میں اس پر عمل

کر رہا تھا۔

ساڑھے تین گھنٹے میں سرنگاپٹم آ گیا جس کے بارے میں اقبال نے جاوید نامہ میں کہا ہے

تخم اشکے ریختم اندر دکن
لالہ ہا روئید زخاکِ آں چمن
رودِ کاویری مدام اندر سفر
دیدہ ام در جانِ اُو شورے دگر

(میں نے اپنے آنسوؤں کے بیج جنوبی ہند میں بوئے جس کی خاکِ چمن میں لالہ وگل کی فصلیں لہلہا رہی ہیں' کاویری دریا ہر وقت سفر میں رہتا ہے اور میں نے اس کے طلاطم میں ایک دوسری ہی طرح کا شور محسوس کیا ہے)

دریائے کاویری سرنگاپٹم کے باہر بہہ رہا ہے اور اس دریا کے تموج میں چشمِ زائر کو جو حُسن نظر آتا ہے وہ شاید ہی کسی دوسرے دریا میں ہو' بہشتِ بریں میں جب سلطان شہیدؒ سے "زندہ رود" (اقبال) کی گفتگو ہوتی ہے تو سلطان انہیں اپنے شہر کا زائر کہہ کر پکارتے ہیں ؂

زائرِ شہر و دیارم بودہٗ
چشمِ خود را بر مزارم سودہٗ

میں خوش نصیب تھا کہ اس شہر کے زائرین کی فہرست میں اقبال کے ساتھ ساتھ میرا نام بھی شامل ہو رہا تھا'

مزار کے باہر پروفیسر سیّد منظور احمد میسور کے بعض دوسرے احباب کے ساتھ ہمارے انتظار میں تھے ہم رستے میں رکتے رکاتے دو تین گھنٹے کی تاخیر سے یہاں پہنچے مگر یہ منظور صاحب اور ان کے دوستوں کا خلوص تھا کہ وہ برابر ہماری راہ دیکھتے رہے' صندل کا درخت یہاں بہتات سے ہوتا ہے اس کے دوسرے بہت سے استعمال تو مجھے معلوم تھے مگر صندل کی لکڑی کا بنا ہوا ہار پہلی دفعہ دیکھا۔ منظور صاحب نے یہ ہار میرے گلے میں ڈالا تو پورا ماحول معطر ہو گیا اور یہ ضروری بھی تھا' سلطان شہیدؒ کے مزار پر جانے کے لئے وضو کے علاوہ خوشبو لگانے کی بھی ضرورت تھی میں باوضو تو تھا مگر خوشبو میرے پاس نہ تھی کہ رستے میں لگا لیتا ویسے بھی آج کل کے بنے ہوئے یوڈی کلون اور پرفیوم الکحل سے بنتے ہیں اور شہیدؒ کے مزار کے لئے وہ یوں بھی نامناسب رہتے' صندل کی لکڑی کا بنا ہوا یہ ہار اس مقصد کے لئے عطیۂ الٰہی سے کم نہ تھا (یہ ہار میں اپنے ساتھ لے آیا ہوں اور آج کل یہ میرے کپڑوں کی الماری میں لٹکا ہوا ہے)

یہ مزار خود سلطان شہید نے تعمیر کرایا تھا اور شروع میں اس میں ان کے والد ماجد سلطان حیدر علی اور ان کی والدہ ماجدہ فاطمہ مدفون تھیں' یہیں مسجدِ اقصیٰ کے نام سے ایک خوبصورت مسجد بھی ہے شہادت کے بعد سلطان کو بھی اپنے عظیم ماں باپ کے پہلو میں دفن کیا گیا' عمارت اسلامی فنِ تعمیر کا حسین نمونہ ہے اور

اس کے دروازوں پر بڑے پُرمعنی اشعار تحریر ہیں' سلطان کے والد حیدر تھے اور ماں فاطمہ' اس مناسب سے شہید ٹیپو کو ان اشعار میں بڑا مؤثر خراجِ تحسین پیش کیا گیا ہے' مشرقی دروازہ پر جو قطعہ درج ہے وہ ان کے والد ماجد کی شان میں ہے ؎

در مُلکِ حجاز از علی حیدرؓ
مفتوح شدہ ہفت قلاعِ خیبر
زیں حیدرِ دکنی دول کرناٹک
گشتند مطیع یک خدیوِ کشور

(ملک حجاز میں حضرت علی مرتضیٰؓ کے ہاتھوں خیبر کے سات قلعہ فتح ہوئے اور دکن کے اس حیدر کی وجہ سے کرناٹک کی تمام ریاستیں ایک امیر سلطان کے زیرِ نگیں آ گئیں)

دوسرے دروازے پر ٹیپوؒ کے لئے کسی شاعر کا یہ قطعہ درج ہے

آں سیّدِ شہدائے عرب سبطِ نبیؐ
لختِ جگر فاطمہؓ و جانِ علیؓ
از فاطمہ و حیدرِ دکنی' ٹیپو
سلطانِ شہیداں شدہ و جانِ ولی

(حضرت فاطمہؓ اور جناب علیؓ کے لختِ جگر اور سبطِ نبیؐ (جناب حسینؓ) سیّدِ شہدائے عرب ہوئے اور دکن کے حیدر اور فاطمہ کے فرزند (ٹیپو) شہیدوں کے بادشاہ اور اولیاء کی جان بن گئے)

صدر دروازے پر لکھا ہے ؎

نہ شادی داد سامانے نہ غم آورد نقصانے
بدیں جانباز سلطانے کہ آمد شد چو مہمانے

(اس جانباز سلطان کے لئے نہ تو خوشی سازو سامانِ زندگی بنی اور نہ اسے غم نے نقصان پہنچایا وہ تو اس سرائے عالم میں ایک مہمان کی طرح آیا تھا)

ایک اور قطعہ یہ ہے ؎

از فاطمہؓ زوجۂ علیؓ شیرِ خدا
شُد سبطِ نبیؐ سیّدِ شہداء پیدا
ایں فاطمہ زاد از علی پیدا
ٹیپو سلطان کہ گشت شاہِ شہداء

یہاں کے دوستوں نے بتایا کہ جب حضرت علامہ اقبالؒ "مزارِ شہید" پر حاضر ہوئے تھے تو انہوں نے حکم دیا کہ دروازے بند کر دیئے جائیں اور انہیں تنہا مزار کے پاس چھوڑ دیا جائے وہ کافی دیر وہاں رہے

جب دروازہ کھلا تو ان کی آنکھیں وفورِ گریہ سے سرخ تھیں لگتا ہے کہ جاوید نامہ میں ٹیپو شہید کے ساتھ آپ کی گفتگو اور دریائے کاویری کا پیغام انہی لمحوں کے القا کا نتیجہ ہے۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ دارالعلوم دیو بند کے مہتمم اور ممتاز عالمِ دین اور صوفی حضرت مولانا قاری محمد طیبؒ نے بھی مزارِ شہید پر مراقبہ کیا تھا اور مفکرِ اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی نے بھی کچھ وقت یہاں تخلیہ میں گزارا اور ان حضرات پر بھی جذب و کیف کا ایک عجیب عالم طاری ہوا۔

مزارِ شہید پر آنے والوں کا تانتا بندھا ہوا تھا' اس میں مسلم بھی تھے اور غیر مسلم بھی، غیر مسلم بھی سلطان شہیدؒ کا بے حد ادب و احترام کرتے ہیں انہیں مجاہدِ آزادی تسلیم کرنے کے علاوہ ایک خدا رسیدہ بزرگ بھی مانتے ہیں' سلطان دنیا کے وہ واحد بادشاہ ہیں جن کا باقاعدہ سالانہ عرس ہوتا ہے اور اس پر تقریباً پچاس ہزار سے لیکر ایک لاکھ تک ہر مذہب و ملت کے افراد شریک ہوتے ہیں۔ اقبال نے ٹھیک ہی تو کہا ہے کہ

آں شہیدانِ محبت را امام
آبروئے ہند و چین و روم و شام
نامش از خورشید و مہ تابندہ تر
خاکِ قبرش از مَن و تُو زندہ تر
رفت سلطاں زیں سرائے ہفت رُوز
نوبتِ اُو در دکن باقی ہنُوز

(سلطان ٹیپوؒ جو شہیدانِ محبت کے امام اور ہند' چین' روم اور شام کی آبرو ہیں ان کا نام چاند سورج سے بڑھ کر روشن ہے اور ان کی قبر ہم (نام نہاد) جیتے جاگتے انسانوں سے کہیں زیادہ زندہ ہے' وہ خود اس سرائے دنیا سے کوچ کر گئے لیکن جنوبی ہند میں (دلوں کی سلطنت میں) اب تک ان کا سکہ چلتا ہے)

سرنگاپٹم سے میسور تک کا سفر آدھے پونے گھنٹے کا ہے' ہم یہاں پہلے میسور کے مشہور مسلم راہنما اور ممبر پارلیمینٹ جناب عزیز سیٹھ کے ہاں پہنچے۔ ان کے ایک جوان فرزند کا حال ہی میں جدہ میں انتقال ہوا تھا اور اس کے لئے فاتحہ پڑھنی تھی جناب عزیز سیٹھ ستّر سال سے اوپر ہیں مگر ماشاءاللہ ہر طرح چاق و چوبند اور جوانوں سے بڑھ کر باہمت اور سرگرم عمل ہیں اب پھر الیکشن لڑ رہے تھے (اور اب جب یہ سطریں لکھ رہا ہوں تو پتہ چلا ہے کہ وہ نہ صرف بھاری اکثریت سے صوبائی اسمبلی کے ممبر منتخب ہوئے ہیں بلکہ کرناٹک کی حکومت میں وزیر بھی بن گئے ہیں) سیٹھ صاحب کے ڈرائنگ روم میں لکڑی سے بنی ہوئی شاہ شہیدؒ کی ایک شبیہ رکھی تھی جس میں انہیں تلوار سونتے شیر سے لڑتے دکھایا گیا ہے۔ معلوم نہیں سیٹھ صاحب کو کیسے معلوم ہوا کہ یہ مجھے بہت پسند آئی ہے میں نے تو اسے اٹھا کر بھی نہیں دیکھا تھا صرف نظروں ہی نظروں میں اسے سراہ رہا تھا لیکن لگتا ہے سلطان شہیدؒ کی برکت سے یہاں کے رہنے والے دلوں کی باتیں بھی جان لیتے ہیں۔ انہوں نے اسے پیک کرا کے میری نذر کیا وہ بھی میری کتابوں کی طرح انڈین

کونسل آف کلچرل ریلیشنز کے کارپردازوں کی تحویل میں ہے دیکھئے یہ تحفہ کب مجھ تک پہنچتا ہے! (شکر ہے اب یہ تحفہ بھی موصول ہو گیا ہے)

شام کو فرخیہ کالج میں سیرتِ پاک پر میرا لیکچر تھا اور یہ مجھے پیشگی اطلاع دیئے بغیر رکھ لیا گیا تھا اگر پروفیسر منظور صاحب نہ ہوتے تو میں یہاں بھی وہی مضمون بیان کرتا جو دہلی کی کانفرنس میں میرا موضوع تھا مگر میری عادت یہ ہے کہ ایک آدمی نے بھی کسی موضوع پر پہلے میری کوئی تقریر سن رکھی ہو تو اس کے ہوتے وہی باتیں دہرانا کسی اجتماع میں مجھے، بہت بُرا لگتا ہے یہاں سیرت کے بعض دوسرے گوشوں پر میں نے بات کی اور یہ اس مبارک سرزمین کا فیض تھا کہ دو تین گھنٹے کا مختصر نوٹس ملنے کے باوجود میسور کے اہلِ علم کے اس اجتماع کو میں نے مایوس نہیں کیا۔

اگلے دن بنگلور میں "الامین" سوسائٹی کی طرف سے لنچ تھا اور اس سے دو گھنٹے قبل اس کے اراکین کے ساتھ تبادلۂ خیال کی مجلس، "الامین" کے بانی ڈاکٹر ممتاز احمد خان ایک نوجوان آدمی ہیں اور انہوں نے اس علاقے میں جو تعلیمی خدمات انجام دی ہیں ان کی وجہ سے بجا طور پر انہیں جنوبی ہند کا سرسید احمد خان کہا جا سکتا ہے، یہاں کا اردو اخبار "سالار" بھی اسی سوسائٹی کے زیر اہتمام شائع ہوتا ہے، آفسٹ پرنٹنگ ہے تمیں چالیس ہزار کی اشاعت ہوگی اس کے ایڈیٹر مقصود علی خان صاحب بھی تشریف لے آئے تھے، اچھے باخبر اور تجربہ کار صحافی ہیں، ممتاز احمد خان صاحب نے "الامین" کا آغاز بڑے نامساعد حالات میں کیا تھا مگر ان کے اخلاص کا نتیجہ ہے کہ آج اس ٹرسٹ کی زیر نگرانی تقریباً سو ادارے کام کر رہے ہیں۔

ان میں میڈیکل کالج اور گرلز کالج وغیرہ کے علاوہ ایک بینک بھی شامل ہے جس سے ضرورت مندوں کو بلا سود قرضے بھی دیئے جاتے ہیں، کمپیوٹر کی تعلیم کے لئے ایک بلند پایہ سنٹر بھی قائم ہے، مجھے ادارے کی کارکردگی کی تفصیلات بتائی گئیں تو مجھ پر حیرت کا عالم طاری ہو گیا، ہم مسلمانوں کے آزاد ملک میں رہتے ہیں، رات دن خدمتِ اسلام کے لئے نعرہ بازی کرتے نہیں تھکتے مگر ہمارے ہاں کی تنظیمیں مل کر بھی تنہا "الامین" کی تعلیمی اور رفاہی خدمات کا مقابلہ نہیں کر سکتیں، اس وقت دس کروڑ کی تو پراپرٹی "الامین" کی ملکیت میں ہے اور ابھی اس میں برابر اضافہ ہی ہو رہا ہے افسوس کہ ہمارے علماء اور مذہبی کارکنوں کو سیاست نے کہیں کا نہیں رکھا...... ورنہ ہم بھی آدمی تھے کام کے۔

مغرب کے بعد "ورلڈ اسلامک ٹرسٹ" کے زیر اہتمام شہر کے ایک مشہور ہال میں سیرت النبیؐ پر میرا لیکچر تھا، ٹرسٹ کے چیئرمین پروفیسر سید اقبال قادری یہاں کی بڑی فعال شخصیت ہیں اور ان کے شاگردوں کا دائرہ بہت پھیلا ہوا ہے میری آمد کا سن کر انہوں نے مقامی پریس میں میرے بارے میں مضامین بھی لکھے اور یہ جلسہ بھی آراستہ کیا، ہال حاضرین سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا اور اس سے باہر بھی اچھا خاصا مجمع تھا، یہ سلطان شہیدؒ کی کرامت تھی کہ آج سیرت پر میں نے بعض نئے مضامین بیان کئے، سلطان

ٹیپو کی حرّیت مآبی کے حوالے سے سرکار دوعالمؐ کی جائے بعثت "عرب" کے آزاد سرزمین ہونے کا نقشہ میں نے کھینچا اور بتایا کہ عرب میں آپؐ صرف اس لئے ہی مبعوث نہیں ہوئے تھے کہ یہاں گھٹاٹوپ اندھیرا تھا اس کی ایک وجہ یہ تھی کہ یہ ایک آزاد سرزمین تھی اور دنیا بھر کو قیامت تک اسلام کی طرف سے حرّیت اور مساوات کا جو پیغام ملنا تھا اس کے لئے ایسی ہی سرزمین موزوں ہو سکتی تھی جہاں اسلام قبول کرنے والے اوّلیں جان نثار آزادی سے سرشار ہو کر ماسوا اللہ سے آزادی کا پرچار کر سکیں' تقریر کوئی ڈیڑھ گھنٹہ جاری رہی اور خدا کا شکر ہے کہ زبان نے دل اور دماغ کی رفاقت ایک لمحے کے لئے بھی نہیں چھوڑی' جلسے کے آغاز میں ایک بچی نے میر النعتیہ کلام پیش کیا' معلوم ہوتا ہے میری نعتیں یہاں غلام فرید صابری اور مقبول صابری کے نعتیہ لانگ پلے ریکارڈوں کے ذریعے پہنچی ہیں' صابری برادران یہاں بہت مقبول ہیں' وہ یہاں کا دورہ بھی کر چکے ہیں اور جب میں بنگلور پہنچا ہوں تو یہاں کے ٹیلیویژن پر ایک مقامی بزرگ کے عرس کی جو تقریب دکھائی جارہی تھی اس کے پس منظر میں ان کی قوالی بھی ریلے ہو رہی تھی۔

جلسے کے بعد ورلڈ اسلامک ٹرسٹ کی طرف سے میرے اعزاز میں عشائیہ دیا گیا جس میں شہر کے عمائدین' علمائے کرام اور ادیب و شاعر شریک ہوئے۔

بنگلور میں دینی تعلیم کا ایک اہم مرکز بھی قائم ہے جسے جنوبی ہند کا دیوبند کہا جا سکتا ہے' یہ "دارالعلوم سبیل الرشاد" ہے' یہاں کے مہتمم حضرت مولانا ابوالسعود احمد' حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کے متوسّلین میں سے ہیں اور اللہ والے بزرگ ہیں' ان کے صاحبزادے مولانا اشرف سعودی جو ایک اچھے شاعر بھی ہیں تشریف لائے اور بالاصرار دارالعلوم کے معائنہ کی دعوت دی' حیدر آباد دکن کے لئے میری فلائٹ دوپہر کو جارہی تھی وقت میرے پاس بہت کم تھا لیکن ان کے خلوص کے آگے سپر انداز ہونا پڑا' ماشاءاللہ دارالعلوم کی اپنی ایک وسیع و عریض عمارت ہے جہاں ہر طرف سلیقہ اور ڈسپلن نظر آتا ہے' حضرت نے مہمانداری کے بعد دارالعلوم کی خوبصورت اور فراخ مسجد میں چلنے کی دعوت دی جہاں سینکڑوں طلبہ صاف ستھرے کپڑے پہنے میرا انتظار کر رہے تھے' تلاوت کے بعد ان کے صاحبزادے نے سپاسنامہ پیش کیا اپنے چند اشعار بھی میری آمد پر موزوں کئے تھے وہ بھی سنائے اور پھر مجھے دعوتِ خطاب دی' میں نے موقع کی مناسبت سے آدھا گھنٹہ اپنے خیالات کا اظہار کیا' میرا موضوع جدید دور میں تبلیغِ اسلام کی ضروریات اور مقتضیات پر محیط تھا' یہ حضرت مہتمم صاحب کی نورانی شخصیت کا اثر تھا کہ کچھ کام کی باتیں کہنے کی توفیق مل گئی۔

"سلسبیل" کے نام سے دارالعلوم کا اپنا ایک بلند پایہ علمی اور دینی جریدہ شائع ہوتا ہے۔ مجلات چلتے ہوئے میرے ساتھ کر دیئے گئے تھے اس کے سرِورق پر حضرت مہتمم صاحب کا اسم گرامی بطور سرپرست اور ان کے صاحبزادے کا نام بطور مدیر درج تھا۔ بنگلور اور میسور میں میرا قیام بہت مختصر تھا مگر سلطان ٹیپو شہیدؒ کی اس سلطنتِ خداداد کا نقش دل پر لیکر لوٹا ہوں' احباب نے بتایا کہ سلطان کی برکت

سے یہاں ہندو مسلم فساد بھی نہیں ہوتا' سبھی لوگ شہید کے نام لیوا ہیں اور ابھی تک ان کے راج میں جی رہے ہیں' مولانا سالک نے سچ کہا تھا۔

شہید کی جو موت ہے وہ قوم کی حیات ہے

شہید ٹیپوؒ نے جان دیدی مگر اپنی رعایا کی زندگی کا سامان کر دیا۔

دہلی میں سو گھنٹے

اب بھارت کا سفرنامہ اختتام پذیر ہے' ہم دہلی پہلے پہنچے تھے مگر اس سلسلہء مضامین میں اس کا تذکرہ آخر میں آرہا ہے۔ بعض اوقات آخر میں آنے والے کو اوّلیت حاصل ہوتی ہے' پرکار کا نقطہ جہاں آکر ٹھہرتا ہے وہی اوّل بھی ہوتا ہے اور آخر بھی۔ سو بھارت کے معاملے میں یہی مقام دہلی کا ہے' وہ بھارت کا دل ہے اور آخر کار ہر بات دل پر جاکر ٹھہرتی ہے اور جب دل کا جانا ٹھہر جائے تو سمجھ لیجئے کہ کوچ کی منزل آگئی۔

ہم عالمی اردو کانفرنس کے زیرِ اہتمام منعقد ہونے والی پہلی بین الاقوامی رحمتہ اللعالمین کانفرنس میں شریک ہونے دہلی جارہے تھے اس کے اَن تھک اور پُرجوش مدار المہام جناب علی صدیقی کا تعارف پہلے گذر چکا ہے۔ اس کا کریڈٹ انہیں جاتا ہے کہ پہلی مرتبہ بھارت میں اس طرز کی بین الاقوامی سیرت کانفرنس منعقد ہورہی تھی۔ اب انہوں نے سیدنا علی مرتضیٰؓ کے یومِ ولادت کی مناسبت سے بین الاقوامی "جشنِ مولودِ کعبہ" کی داغ بیل بھی ڈال دی ہے اور ان کا کہنا ہے کہ جب تک زندہ ہوں یہ دونوں کانفرنسیں ہر سال باقاعدگی سے منعقد کرتا رہوں گا۔ ہماری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ انہیں تادیر سلامت رکھے تاکہ وہ اسی طرح مسلمانانِ بھارت کی روحانی بالیدگی کا ذریعہ بنتے رہیں۔

لاہور سے دہلی 45 منٹ کا سفر ہے۔ اتنا ہی جتنا لاہور سے اسلام آباد کا ہے۔ ہمارے ساتھ طیارے میں خانہء فرہنگِ ایران کے ڈائریکٹر جناب صادق گنجی بھی سوار ہیں۔ یہ نوجوان بلا کی کشش رکھتا

ہے۔ پاکستان میں انقلابِ ایران کی تمام ترلابی اسی کی پیدا کردہ ہے۔ یہ نہ ہو تو ایرانی سفارت خانے کا وجود عدم وجود برابر ہے۔ پاکستان کے تمام بااثر حلقوں سے اس کے مراسم ہیں۔ شیعہ تو اس سے متاثر ہیں ہی 'اہلسنت بھی اس کے گرویدہ ہیں۔ ہمارا خیال تھا کہ اس کا دائرہ تعارف پاکستان و ایران تک محدود ہو گا مگر اب معلوم ہُوا کہ ان کا نام بھارت میں بھی اچھا خاصا جانا پہچانا ہے۔ آقائے صادق گنجی رُشدی کے مسئلہ پر اپنا مقالہ پیش کرنے کیلئے دہلی تشریف لے جا رہے تھے۔ جناب حسن رضوی بھی موجود ہیں' کسی زمانے میں وہ جریدہ شہاب میں میرے ساتھ کام کر چکے ہیں 'اچھے شاعر بھی ہیں اور اچھے نثر نگار بھی۔ اردو ادب کے عالمی حلقوں میں بڑے اثر و رسوخ کے مالک ہیں اور یہ حضرت حفیظ تائب ہیں 'نعت گوئی میں اپنا ثانی نہیں رکھتے' عشقِ رسولؐ میں ڈوب کر شعر کہتے ہیں اور یہ مشہور شاعر حضرت مظفر وارثی ہیں ان کے اشعار کی نغمگی ان کے دل نشیں ترنم میں ڈھلتی ہے تو دو آتشہ بن جاتی ہے۔ یہ قصور کے محمد علی ظہوری ہیں' نعت گو بھی ہیں اور نعت خوان بھی' پوری عمر مدحتِ رسولؐ میں گزار دی ہے اور میں حضرت اعظم چشتی کو کیسے نہ پہچانتا گو سالوں کے بعد ملے ہیں مگر میرے دل میں آباد ہیں' چہرے پر اب سفید داڑھی بہار دے رہی ہے مگر جن دنوں میں لاہور میں تھا وہ اپنی جوانی کے عروج پر تھے۔ میلاد کی لاتعداد محفلوں میں ان کے ساتھ شریک ہُوا ہُوں۔ ایک درویش صفت انسان ہیں' زبان اور دل میں فاصلہ نہیں رکھتے' عاشقِ رسولؐ ہیں اور نعت خوانی کے امام' پنجابی اور اردو میں ان کی نعتیں بھی مقبول خاص و عام ہیں' دل بھر آیا کہ اب بوڑھے ہو رہے ہیں مگر یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ آواز کی کھنک اب بھی وہی ہے۔

اسلامیات کے ممتاز مُفکّر جناب ڈاکٹر اسرار احمد بھی شریکِ سفر ہیں یہ کانفرنس کے مندوبین میں نہیں ہیں' حیدر آباد دکن جا رہے ہیں مگر انہیں ہم سفر دیکھ کر خوشی ہوئی ہے۔ ڈاکٹر صاحب ایک زمانے میں نوجوانوں کی مشہور دینی تنظیم اسلامی جمعیت طلبہ کے ناظمِ اعلیٰ تھے بعد میں انہوں نے جماعت اسلامی کی رکنیت کیلئے درخواست دی تو میں جماعت اسلامی حلقہ لاہور کا قیّم (سیکرٹری جنرل) تھا' اس زمانے سے ان کی صلاحیتوں کا معترف ہوں بعض بنیادی اختلافات کی وجہ سے جماعت سے الگ ہوئے تو بہت سے لوگوں کا خیال تھا کہیں گردِ کارواں میں گم ہو جائیں گے مگر اپنے خلوص اور شبانہ روز محنت کی وجہ سے انہوں نے اپنا مقام بنایا بھی ہے اور منوایا بھی۔ ایک ایسے قافلہء خیر و خوبی میں سفر کا کیا احساس ہوتا' بس "اِدھر ڈوبے اُدھر نکلے" کے وقفے میں ہم دہلی ایئرپورٹ پر تھے۔

میرا قیام دہلی کے سب سے اعلیٰ ہوٹل "مریڈین" میں ہے' یہ انٹرنیشنل ہوٹل نیا نیا بنا ہے اور بے حد خوبصورت ہے اس کی لفٹ کیپسول نما ہے اور اس میں کھڑے ہو کر باہر کا سارا منظر نگاہوں کے سامنے رہتا ہے۔ ایسی لفٹ یا سنگاپور کے ایک ہوٹل میں دیکھی تھی یا اب اس ہوٹل میں' لابی میں حضرت سید نجم الدین گیلانی کے صاحبزادے حضرت پیر سلمان گیلانی سے ملاقات ہو گئی۔ یہ حضرت غوث الاعظم کے خانوادے سے تعلق رکھتے ہیں اور ہمارے مرحوم دوست اور سابق سفیرِ عراق حضرت سید عبدالقادر

گیلانی کے بھتیجے ہیں ان کے والد ماجد سے بھی میری ملاقات تھی اور ان کے چچا تو ہماری وزارت کے مشیر تھے اور ایک سال سفرِ حج میں بھی ہمارے ساتھ تھے' ماشاء اللہ مردانہ وجاہت کا مرقع ہیں اور نجیب الطرفین سیّد ہونے کی وجہ سے چہرے پر نورانیت کا ہالہ ہے۔ سلمان صاحب اپنے خاندان سے میرے دیرینہ تعلقات سے آشنا ہیں اس لئے بڑے تپاک سے ملے اور جب تک رہے میرے ساتھ ہی کانفرنس ہال آتے جاتے رہے۔

رات کو علی صدیقی صاحب کی طرف سے ہمارے اعزاز میں ڈنر تھا' یہ عالمی اردو کانفرنس کے سیکرٹریٹ کی عمارت میں ترتیب دیا گیا ہے' اسی شاندار اور موقع کی عمارت میں صدیقی صاحب' اردو "میوزیم" بھی قائم کرنا چاہتے تھے مگر کانگریس کی حکومت الاٹمنٹ کے وعدے سے پھر گئی۔ انہوں نے اس آرڈر کے خلاف عدالت کا دروازہ کھٹکھٹایا چنانچہ اب اگر فیصلہ ان کے حق میں نہ ہوا تو کانفرنس کا مرکز حیدر آباد دکن منتقل ہو جائے گا جہاں وہ خود اسے تعمیر کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں اردو میوزیم بھی بنے گا اور اردو کانفرنس کی لائبریری بھی

کانگریس کے یہی اقدامات تو ہیں جن سے مسلمان اس سے بدک گئے تھے۔ اردو زبان کے ساتھ یہ سوتیلا سلوک رنگ لایا اور محسنہ قدوائی جن کی وزارت نے عالمی اردو کانفرنس کی عمارت خالی کرنے کا نوٹس جاری کیا تھا ایک لاکھ ووٹوں کے فرق سے ہار گئیں' علی صدیقی صاحب نے اپنی روائتی رواداری میں وزیر صاحبہ کے حق میں پوسٹر بھی جاری کر دیا تھا مگر ووٹر اس خبر سے ناراض ہو چکے تھے اور انہوں نے الیکشن میں انہیں چلتا کر دیا۔

کراچی سے حضرت راغب مراد آبادی اور جناب اقبال صفی پوری بھی شریک محفل تھے۔ یہ دونوں حضرات عالمی نعتیہ مشاعرے میں شریک ہونے کے لئے تشریف لائے ہیں۔ حضرت راغب اس دَور ہی میں نہیں اردو شاعری کی پوری تاریخ میں بدیہہ گوئی میں اپنی مثال آپ ہیں' حضرت مولانا ظفر علی خان مرحوم کو چھوڑ کر کوئی دوسرا شاعر اس میدان میں ان کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ قادر الکلام ایسے کہ ابھی کچھ عرصہ پہلے ان کی نعتوں کا ایک ایسا مجموعہ شائع ہوا ہے جس کے تمام الفاظ غیر منقوط ہیں اسے دیکھا تو فیضی کی تفسیر "سواطع الالہام" یاد آگئی کہ اس میں استعمال ہونے والے تمام لفظوں پر بھی کوئی نقطہ نہیں' حضرت اقبال صفی پوری بھی اس زمرۂ شعراء میں شامل ہیں جن کا وجود اور کلام دونوں "تبرکات" میں شامل ہیں' ان کے اشعار عام طور پر سہلِ ممتنع کی تعریف میں آتے ہیں اور پڑھنے کا انداز ایسا دل نشین ہے کہ مشاعرے پر چھا جاتے ہیں' کراچی میں ہر سال ایک کل پاکستان بلکہ پاک وہند نعتیہ مشاعرہ بھی حسنِ اہتمام سے منعقد کرتے ہیں۔ ان حضرات کو دیکھ کر بہت خوشی ہوئی۔ شرکائے طعام میں صوبہ سرحد کے نامور مجاہدِ آزادی محمد یونس خان بھی تھے اور اردو کے مشہور ادیب پنڈت گوپی چند نارنگ بھی' پنڈت جی سے تو میری پہلے سے یاد اللہ ہے مگر خان صاحب سے پہلی مرتبہ ملاقات ہو رہی تھی عجیب باغ وبہار آدمی ہیں' ان

دونوں حضرات کے بارے میں اپنے تعارفی اور تاثراتی کلمات آگے چل کر عرض کروں گا۔

کچھ عرصے سے میں نے صبح کی سیر شروع کر رکھی ہے۔ تازہ تازہ جوش تھا اس لئے اپنے "جاگرز" ساتھ لے آیا اور ایک سویٹر بھی مگر اندازہ نہ تھا کہ دلی کا موسم اسلام آباد سے مختلف ہو گا یہاں ابھی اچھی خاصی گرمی ہے پھر بھی صبح سویرے سویٹر پہننا بوجھ نہ لگا۔ میں نے "ویک اپ کال" دہلی کے وقت کے مطابق ساڑھے پانچ بجے دی تھی (واضح رہے کہ دہلی کا وقت ہم سے آدھ گھنٹہ آگے ہے) میں دن کے وقت سویا نہ تھا خیال تھا کہیں سوتا نہ رہ جاؤں مگر "ویک اپ کال" کی گھنٹی بجنے سے پہلے ہی میں پونے پانچ بجے اٹھ کھڑا ہوا' نماز پڑھ کر روانہ ہوا مگر باہر اچھا خاصا اندھیرا تھا' ہوٹل کے گیٹ پر لطیفہ ہو گیا' میں سفر میں رات کے لباس کے طور پر عربی "توب" پہنتا ہوں (اصل عربی "ثوب" ہے لیکن اس کا تلفظ بگڑ کر "توب" اور ہمارے ہاں "توپ" ہو گیا ہے) ٹخنوں تک یہ لمبی قمیض 'اوپر سویٹر اور ہاتھ میں تسبیح لئے میں پاکستانی یا ہندوستانی سے زیادہ عرب لگ رہا تھا' باہر سردار جی گیٹ کیپر تھے مجھے دیکھا تو "شیخ صاحب! سلام کہہ کر حقِ معرفت ادا کر دیا۔

ہوٹل سے باہر نکلا تو بلا مبالغہ بیسیوں بوڑھے جوان بچے درختوں کی داتین منہ میں دبائے سیر کرتے ملے۔ ان میں سے کوئی ڈنڈ پیل رہا تھا تو کوئی "جاگنگ" کر رہا تھا' کوئی "یوگا" میں مشغول تھا تو کوئی چہل قدمی میں' چہروں سے یہ لوگ زیادہ تر ہندو لگے' مسلمانوں میں شاید "سیرِ صبح گاہی" کا رواج کم ہے۔ صرف اسلام آباد میں کچھ بڑے بوڑھے ریٹائرڈ افسران صبح دم چھڑی گھماتے مرگلہ پہاڑی کی طرف آتے جاتے نظر پڑتے ہیں ورنہ نوجوان طبقہ کیلئے بقول اقبالؒ "کس قدر تم پہ گراں صبح کی بیداری ہے" کا مصرع صادق آتا ہے "مریڈین" سے انڈیا گیٹ کوئی ڈیڑھ دو میل کے فاصلے پر ہو گا یہ انگریزوں نے بنایا تھا یہاں ایک نہ بجھنے والا ہر آن جلتا ہوا شعلہ فروزاں ہے میں تحقیق نہیں کر سکا یہ اہتمام بھارتی حکومت نے شروع کیا تھا یا انگریزوں نے 'اگر انگریزوں نے کیا ہو گا تو اپنی حکومت کے دفاع میں لڑ مرنے والوں کی یاد میں کیا ہو گا کیونکہ انڈیا گیٹ کی چھت اور دیواروں پر بھی ان لاتعداد سپاہیوں اور افسروں کے نام لکھے ہیں جو جنگِ عظیم میں انگریزی فوج کے ہمراہ لڑتے ہوئے مارے گئے تھے۔

پونے دس بجے صبح "رحمتہ اللعالمین کانفرنس" کے افتتاحی اجلاس میں شرکت کیلئے روانہ ہوئے' کانفرنس دہلی کے مشہور "ایوانِ غالب" ہال میں منعقد ہو رہی تھی۔ پورا راستہ طرح طرح کی جھنڈیوں سے آراستہ تھا۔ ہال سے باہر جناب علی صدیقی اپنی کمیٹی کے اراکین کے ساتھ مندوبین کے استقبال کیلئے موجود تھے۔ یہیں حضرت خواجہ حسن نظامیؒ کے لائق صاحب زادے خواجہ حسن ثانی نظامی بھی مل گئے' حسن ثانی سے میری ملاقات اپنے پرانے دوست عابد نظامی صاحب کے ہاں پچاس کے عشرے میں لاہور میں ہوئی تھی 'اس وقت سے لے کر اب تک ہمارے تعلقات میں فرق نہیں آیا 'اہلِ تصوف میں اپنے علمی انداز کی وجہ سے خواجہ صاحب کا دم غنیمت ہے' ہال میں اسٹیج کو بڑی خوبصورتی سے سجایا گیا تھا' سفید

چاندنیاں بچھی ہوئی تھیں اور ان پر چھوٹے چھوٹے خوبصورت گاؤ تکیے عجب بہار دے رہے تھے۔ مقررین کیلئے ایک ایستادہ ڈائس کا انتظام تھا جو پھولوں سے لدا ہوا تھا مگر اسٹیج سیکرٹری اور قاری کیلئے فرشی مائیک کا انتظام تھا۔ مدھیہ پردیش کے سابق وزیر اعلیٰ ارجن سنگھ آج کے صدر تھے اور میں اور پیر سیّد سلمان گیلانی مہمانانِ خصوصی' ہمارے ساتھ ایران' سعودی عرب' پی ایل او' پاکستان اور عراق کے سفیر بھی تشریف فرما تھے۔

عراق سے آنے والے ایک قاری نے تلاوت کی اور سماں باندھ دیا' ہال میں تقریباً ایک ہزار نشستیں ہیں وہ سب پُر تھیں' کچھ سکھ اور ہندو بھی اجتماع میں نظر آئے اور خواتین کا ایک گروپ بھی' عراقی قاری کے بعد کراچی سے پاکستان کے مشہور قاری جناب شاکر قاسمی کا نام پکارا گیا۔ یہ ہمارے مرحوم دوست مولانا زاہر قاسمی کے چھوٹے بھائی ہیں۔ یو این او میں صدر جنرل ضیاء الحق مرحوم کی وجہ سے انہیں تلاوتِ کلامِ پاک کا منفرد اعزاز حاصل ہے۔ ان کی تلاوت کے بعد مشہور خوش گو اور خوش الحان شاعر حضرت مظفر وارثی نے اپنا نعتیہ کلام پیش کیا اور پھر جناب اعظم چشتی تشریف لائے ان دونوں نے مجمع پر سحر طاری کر دیا۔

اب جناب علی صدیقی نے مہمانوں کو تحائف پیش کیے انہیں نام بنام گرم اونی شال پہنائی گی' گلے میں طلائی ہار ڈالے گئے' ایک خوبصورت بیگ دیا گیا' جس میں قرآن حکیم' جائے نماز اور عالمی اردو کانفرنس کے جریدہ "اردو مورچہ" کا رحمتہ اللعالمین نمبر تھا۔ تمام حاضرین میں سفید جالی دار ٹوپیاں تقسیم کی گئیں۔ علی صاحب کی انتظامی صلاحیتیں تو مُسلّم ہیں ہی اللہ نے انہیں دل بھی بڑا دیا ہے۔ اس کانفرنس پر انہوں نے دل کھول کر اپنا سرمایہ خرچ کیا ہے۔

اردو کے مشہور ادیب پنڈت گوپی چند نارنگ نے خطبۂ استقبالیہ پیش کیا' نارنگ جی اُن گنے چُنے لوگوں میں شامل ہیں جو خوبصورت اردو لکھتے بھی ہیں اور بولتے بھی' صُلحِ کُل مزاج پایا ہے۔ تمام مذاہب کے راہنماؤں کا احترام کرتے ہیں اور پیغمبرِ اسلامؐ کی ذاتِ والا صفات سے تو انہیں خصوصی لگاؤ ہے' نقاد بھی اعلیٰ درجے کے ہیں' ابھی حال ہی میں بھارت کی حکومت نے انہیں ایک اعلیٰ سرکاری اعزاز عطا کیا ہے۔ پاکستان اور ہندوستان دونوں ملکوں کے علمی اور ادبی حلقوں میں انہیں قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ ان کا خطبہ زبان و بیان سے لے کر اپنے مفاہیم و مطالب تک ہر لحاظ سے خاصے کی چیز تھا۔

سعودی عرب' ایران اور پی ایل او کے سفیروں نے بھی کانفرنس میں تقریریں کیں مگر پاکستان کے سفیر نے خطاب نہیں فرمایا۔ یہی کیا کم ہے کہ ہمارے سفارت کار اس طرح کی تقریبات میں جلوہ افروز ہو جاتے ہیں۔ رہا ان میں بولنا تو شاید یہ ان کے مقام سے فروتر اور پروٹوکال کے خلاف ہے' اس کمی کو میں نے محسوس کیا تو یقیناً حاضرین نے بھی محسوس کیا ہو گا۔

عراقی مندوب کی تقریر تمام تر اپنا پراپیگنڈہ تھی' عید میلاد النبیؐ کا کریڈٹ بھی عراقی حکومت کو عطا کر دیا' کہا کہ یہ تقریب بھی اوّل اوّل ہم نے شروع کی تھی۔ ان کے اس دعوے سے بدعت اور سُنّت کی جو

بجتیں اٹھ سکتی تھیں صاحب موصوف نے ان کا بھی اندازہ نہیں کیا۔ ایران پر بھی حملہ کیا کہا کہ وہ ہمارے قیدیوں کو واپس نہیں کر رہا۔ ایرانی سفیر برابر اسٹیج پر بیٹھے کسمساتے رہے۔ جناب رحیم پور پاکستان میں بھی چارج ڈی افیئرز رہ چکے ہیں اور ایک پُرجوش مسلمان ہونے کے ساتھ ساتھ منجھے ہوئے سفارت کار بھی ہیں۔ جواب دینا چاہتے تھے مگر بدمزگی ہو جاتی' میرے قریب بیٹھے تھے میں نے بھی سمجھایا' صبر کر گئے ورنہ رنگ میں بھنگ پڑ جاتا۔

عراقی مندوب کی طرح جناب فاروق عبداللہ کی تقریر بھی تمام تر سیاسی تھی مگر وہ بات کرنا جانتے ہیں اس لئے اپنی تقریر کے دوران انہوں نے تالیاں خوب پٹوائیں۔ حالات سے مایوس تھے کہا کہ پیغمبرؐ کی تعلیمات پر کوئی عمل نہیں کرتا۔ پاکستان پر بھی کرم فرمائی کی۔ فرمایا پاکستان ہمیں اپنے حال پر چھوڑ دے۔ جنگ کے جنون سے باز رہے ایک بات البتہ کام کی کی۔ دُور درشن پر رامائن اور مہابھارت کے جو لگاتار پروگرام آ رہے ہیں ان کے حوالے سے کہا "صرف یہی پروگرام کیوں دکھاتے ہو اسلام کی باتیں بھی بتاؤ کہ لوگوں کو پتہ چلے ہمارا مذہب کیا ہے"؟

صدر اجلاس کے مختصر خطاب سے پہلے بطور مہمانِ خصوصی میرا خطاب تھا' میں موضوع سے ہٹ کر بولنے کا عادی نہیں۔ فاروق عبداللہ صاحب کے حوالے سے صرف اتنا کہا کہ وہ شاید ہم مسلمانوں سے ضرورت سے کچھ زیادہ ہی مایوس ہیں' اس ایک جملے ہی سے تالیوں کا طوفان اٹھ کھڑا ہوا پھر اسلامی تعلیمات کی روشنی میں پڑوسیوں کے حقوق کا مضمون چھیڑ کر بالواسطہ پاکستان میں جنگ کے جنون کی بھی تردید کی۔ بس یہ چند مثبت جملے ہی فاروق صاحب کی تمام تقریر کے اثرات کو بہالے جانے کیلئے کافی تھے۔ بقیہ تقریر سیرتِ پاکؐ کے موضوع پر تھی اور خدا کا شکر ہے کہ اس سے ہال کے ماحول میں سرکار رسالتمآب صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی عظمت و محبّت کی خوشبو رچ بس گئی' صدر نے اٹھ کر مبارکباد دی' فاروق عبداللہ بھی گلے ملے' پاکستانی مندوبین بھی خوش تھے کہ ان کا حق نمائندگی ادا ہو گیا۔

شام کے چھ بجے بھارتی وزارتِ خارجہ کے سیکرٹری ڈاکٹر ایس کے سنگھ سے ملاقات تھی۔ ایس کے سنگھ پاکستان میں کئی سال بھارت کے سفیر رہ چکے ہیں اور یہاں وہ مقبول ترین سفیروں میں شامل تھے۔ ان کی بیگم بھی بہت با اخلاق اور ذہین خاتون ہیں اور میری ان دونوں سے ان کے قیامِ اسلام آباد کے زمانے سے یاد اللہ چلی آ رہی ہے۔ میرے آنے کی اطلاع ملی تو دفتر سے باہر آ کر میرا استقبال کیا۔ حسبِ عادت گرم جوش معانقہ کیا اور پھر ہاتھ میں ہاتھ ڈالے وزارتِ خارجہ کے دفتر میں کام کرتے ہوئے افسروں کے درمیان سے گزرتے مجھے اپنے دفتر میں لے گئے۔ ایک ایک دوست کا نام لے کر اس کی خیریت پوچھی' گھر میں فون کر کے اپنی بیگم (منجو) سے بات کرائی۔ انہوں نے کہا کہ "تم کھانا کھائے بغیر واپس نہیں جا سکتے" گھنٹہ بھر گپ شپ کے بعد پھر اسی طرح میرے ساتھ باہر نکلے' گاڑی میں بٹھایا اور میں پورا راستہ پاکستان اور ہندوستان کے سفارت کاروں کے درمیان پائے جانے والے فرق پر غور کرتا رہا۔ میں اپنی

وزارتِ خارجہ کے بعض افسروں اور سفیروں کا دل سے مدّاح ہوں مگر ان چند مستثنیات کو چھوڑ کر وزارت کے اکثر لوگ پروٹوکال اور رسمیات کے مارے ہوتے ہیں ان کا خیال ہے کہ کامیابی کی کلید اعلیٰ درجے کے سوٹ اور بناوٹی لب ولہجہ میں انگریزی بولنا ہے۔ اس کے برعکس بھارتی وزارتِ خارجہ میں سادگی ہے' پہناوے میں بھی' مراسم کے دکھلاوے میں بھی' آپس میں یہ لوگ عام طور پر ہندوستانی زبان میں بات کرتے ہیں۔ یہاں سیکرٹری بلکہ وزیر بھی بے تکلف اپنے ماتحتوں کے کمرے میں اٹھ کر چلا جائے گا اگر کہیں خدانخواستہ پاکستان کی وزارتِ خارجہ میں ایسا ہو جائے تو یہ نصف صدی کی سب سے بڑی خبر بن جائے' اس فرق کا سبب یہ ہے کہ بھارت میں ہمیشہ سیاسی حکومتیں برسرِ اقتدار رہی ہیں۔ وزارت کو سیاسی لیڈروں سے واسطہ پڑتا رہا ہے۔ ہمارے ہاں فوجی حکمران رہے ہیں جن کے ہاں وردی کا بے داغ ہونا سلامی لینا اور دینا اور بات بے بات اٹنشن ہو جانا روز مرے میں شامل ہے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ ہماری وزارتِ خارجہ اور اس کے افسر ملکی نظام اور معاشرے میں الگ تھلگ "جزیرہ" بن گئے۔

اگلے روز دوپہر کو ہفت روزہ "اخبارِ نو" دہلی کے مدیر جناب م۔ افضل تشریف لے آئے' دہلی سے اردو کے دو مشہور ہفت روزے نکلتے ہیں "نئی دنیا" اور "اخبار نو" م۔ افضل پہلے "نئی دنیا" کے ایڈیٹر جناب شاہد صدیقی کے رفیقِ کار تھے اب انہوں نے اپنا اخبار نکالا ہے اور دیکھتے ہی دیکھتے یہ "نئی دنیا" اور "بلٹز" کے بعد اردو کا تیسرا بڑا ہفت روزہ بن کر اُبھرا ہے۔ ان سے لیبیا کی بین الاقوامی کانفرنس میں ملاقات ہوئی تھی۔ یہ آج ہمیں "کریم بھائی کے ہوٹل" میں کھانا کھلانا چاہتے تھے' کریم بھائی کا ہوٹل بستی نظام الدین اولیاؒ میں تبلیغی جماعت کے مرکز کے قریب واقع ہے اور اپنے چٹ پٹے کھانوں اور واجبی نرخوں کی وجہ سے دہلی کے مقبول ترین ریستورانوں میں شامل ہے۔ میں جس زمانے میں لاہور میں رہتا تھا' لوہاری دروازے کے باہر نعمت کدہ ہوٹل بھی ان دنوں کچھ ایسا ہی مشہور و مقبول تھا۔ اکثر میں اور میرے مرحوم دوست جناب ابو صالح اصلاحی دوپہر کا کھانا یہیں کھایا کرتے تھے۔ "کریم بھائی کے ہوٹل" کو اس زمانے کا نعمت کدہ سمجھ لیجیے۔ تنگ گلیوں سے گذرتے ہم ریستوران میں پہنچے اپنی پسند کا آرڈر دیا تو کہیں سے ایک مکھی در آئی' افضل صاحب نے غصے میں منیجر کو بلوایا اسے خوب ڈانٹا' پتہ چلا کہ ایک زمانے میں افضل صاحب خود اس ہوٹل میں منیجر رہ چکے ہیں۔ اس لئے وہ صفائی کے موجودہ معیار کو دیکھ کر سخت برافروختہ تھے۔ مگر .... اس طرح تو ہوتا ہے اس طرح کے کاموں میں .... یہ بھی تیسری دنیا کے ملکوں کا المیہ ہے کہ ان میں جب کسی چیز کی مانگ بڑھ جاتی ہے اس کا معیار آپ سے آپ گر جاتا ہے!

شام کو خانۂ فرہنگِ ایران دہلی میں "ہفتۂ وحدت" کے سلسلے میں ایک جلسہ تھا۔ یہ ہفتہ ربیع الاوّل کی آمد پر حکومتِ ایران کی زیرِ ہدایت اس کے تمام سفارت خانے متعلقہ ملکوں میں منا رہے ہیں۔ سفیرِ ایران جناب رحیم پور اور ہمارے دوست آقائے صادق گنجی نے مجھے یہاں مہمانِ خصوصی بنا رکھا تھا۔ وقت مقررہ پر کچھ ایرانی نوجوان مجھے لینے آ گئے۔ میرے پاس اس وقت کچھ اخبار نویس دوست بیٹھے تھے اور

ویسے بھی نو بجے رات عالمی نعتیہ مشاعرہ میں مجھے مہمانِ خصوصی کی حیثیت سے تمام شب اسٹیج پر بیٹھنا تھا۔ سوچا خانۂ فرہنگ کی تقریب کو گول کر دوں، معذرت کر کے انہیں واپس کر دیا۔ اب سفارت خانے والوں نے فون پر فون کرنے شروع کر دیئے، کچھ دیر کے بعد دوبارہ ان کے آدمی لینے آ گئے۔ جلسہ چھ بجے شام سے شروع تھا۔ میں کوئی آٹھ بجے پہنچا۔ لگتا ہے میرا ہی انتظار تھا۔ میں نشست پر بیٹھا ہی تھا کہ میری تقریر کا اعلان ہو گیا۔ میری تقریر کے بعد صدارتی کلمات جاری تھے کہ جامع مسجد دہلی کے امام مولانا عبداللہ بخاری بھی تشریف لے آئے۔ انہیں بھارت کا مولانا عبدالقادر آزاد سمجھ لیجئے۔ وہی تن و توش وہی گھن گرج بس فرق صرف اتنا ہے کہ ہمارے مولانا آزاد کچھ زیادہ پڑھے لکھے آدمی ہیں۔ امام صاحب بس امام ہی امام ہیں۔ غنیمت ہے کہ انہوں نے خطاب نہیں فرمایا ورنہ نعتیہ مشاعرہ دھرے کا دھرارہ جاتا۔

نعتیہ مشاعرہ کی صدارت پاکستان کے مشہور ادیب اور معلم حضرت ابوالخیر کشفی کر رہے تھے۔ سیدھے سادے صوفی منش آدمی ہیں اور عشقِ رسولؐ سے سرشار ہیں۔ نعت بھی اچھی کہتے ہیں۔ لکھنؤ کے نامور شاعر اور ادیب پروفیسر ملک زادہ منظور احمد ناظمِ مشاعرہ تھے۔ شاعر اتنے زیادہ تھے کہ صبح کے تین بج گئے۔ مجمع اُمڈ کر آیا تھا اور اختتام تک جم کر بیٹھا رہا۔ پاکستان سے اعظم چشتی، مظفر وارثی، حسن رضوی، قیصر بارہوی، حفیظ تائب، اقبال صفی پوری، راغب مراد آبادی، اختر لکھنوی اور خود صاحبِ صدر سبھی کا کلام پسند کیا گیا مگر حضرت بہزاد لکھنوی کے پوتے جناب اعظم بہزاد نے مشاعرہ لُوٹ لیا۔ ان کے ترنم اور شاعری میں ان کے دادا حضرت بہزاد کا فیضان صاف نظر آ رہا تھا۔ مشاعرے کی ایک اور خصوصیت ہندو شاعروں کی نعتیں تھیں۔ پنڈت گلزار نسیم دہلوی تو خیر ہمیشہ عقیدت میں ڈوب کر نعت کہتے ہی ہیں۔ ایک ہندو شاعر پنڈت پرکاش جوہر کے اس شعر نے بھی بہت داد حاصل کی ؎

میں ہندو ہوں مگر ایمان رکھتا ہوں محمدؐ پر
کوئی انداز تو دیکھے میری کافر ادائی کا

کنور مہندر سنگھ بیدی کی کمی البتہ محسوس ہوئی، ان کی نعت کا ایک شعر میں نے اختتامی اجلاس میں اپنی تقریر میں پڑھا تھا۔

انسانیت، محبتِ باہم، تمیز، عقل
جو چیز بھی ہے سب ہے عنایت رسولؐ کی

تین چار ملاقاتیں اور بہت اہم ہوئیں اور اہم شخصیات کے ساتھ ہوئیں۔ سید مظفر برنی بھارت کے ایک بڑے نستعلیق اور پڑھے لکھے اعلیٰ افسر ہیں، گورنر بھی رہ چکے ہیں اور ان دنوں اقلیات کمیشن کے چیئرمین ہیں۔ "قادیانی مذہب" کے مؤلف سید الیاس برنی ان کے چچا تھے، وہ خود بھی اپنی سرکاری مصروفیات کے باوجود علمی اور تالیفی کاموں کیلئے کچھ نہ کچھ وقت نکال لیتے ہیں۔ علامہ اقبالؒ پر ان کی ایک کتاب شائع ہو چکی ہے اور ان دنوں وہ "مکاتیبِ اقبالؒ" کی کلیات ترتیب دینے کا اہم کام انجام دے

رہے ہیں' ایک ضخیم جلد اس کی شائع ہو چکی ہے۔ دو اور جلدیں آنے والی ہیں۔ علامہ کے مکتوبات میں جس کسی کا بھی ذکر آیا ہے یا جسے انہوں نے خط لکھا ہے' مظفر صاحب نے اس پر حاشیہ لکھا ہے۔ اس طرح انہیں جتنی محنت کرنی پڑی ہوگی وہ محتاجِ بیان نہیں۔ ان کے ہاں چائے پی' باتیں کیں تو ہندوستان کے عہدِ رفتہ کا اردو معاشرہ یاد آ گیا' مظفر برنی اس کی باقیات کا ایک زندہ نمونہ ہیں۔

انڈین کونسل آف کلچرل ریلیشنز کی ڈائریکٹر جنرل وینا سیکری سے بھی ملاقات رہی۔ یہ کونسل بھارت کے پہلے وزیر تعلیم اور برِ صغیر کے مایۂ ناز مفکر حضرت مولانا ابوالکلام آزاد نے مختلف ثقافتوں کے درمیان تہذیبی مفاہمت کیلئے قائم کی تھی۔ مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی کونسل کی طرف سے نکلنے والے اوّلیں عربی جریدہ "الہند" کے ایڈیٹر مقرر ہوئے تھے۔ اس وقت بھارت کے ہر بڑے شہر میں کونسل کا دفتر اور اس کے مستعد کارکن موجود ہیں۔ وینا جی فارن آفس میں جائنٹ سیکرٹری کا عہدہ رکھتی ہیں اور بڑی دلکش شخصیت کی مالک ہیں۔ ان کے ہمراہ کونسل کی لائبریری بھی دیکھی۔ لائبریرین جناب جمیل نقوی اپنے کام میں ماہر اور علم و ادب سے گہرا شغف رکھتے ہیں۔ انہوں نے مولانا آزاد کے ہاتھ سے لکھے ہوئے کئی مسودے بھی دکھائے۔ انہی میں ان کی مشہور تفسیر "ترجمان القرآن" کا مسودہ بھی شامل ہے۔ مولانا کی تحریر بڑی بڑی صاف اور خوبصورت تھی۔ لگتا ہے وہ اپنے نوشتے پر بار بار نظر ثانی کرتے تھے۔ اسی لئے جگہ جگہ کانٹ چھانٹ اور ترمیم و درستی بھی نظر آئی۔ نقوی صاحب نے بتایا کہ مولانا کے ذاتی کتب خانے میں تقریباً آٹھ ہزار کتابیں تھیں جو انہوں نے وفات کے وقت کونسل کی لائبریری کو عطا کر دی تھیں۔ مولانا کی مملوکہ کتب کا سیکشن بھی دیکھا اور بعض کتابوں پر مطالعہ کرتے وقت ان کے لکھے ہوئے حواشی بھی نظر سے گذرے' بھارت کے ایک صاحبِ علم نے حال ہی میں زیرِ مطالعہ کتابوں پر مولانا کے ان تمام حاشیوں کا مجموعہ شائع کر دیا ہے۔

شیخ الاسلام حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ کے صاحب زادے مولانا اسد مدنی کے ساتھ بھی چائے پی۔ "امارتِ شرعیہ ہند" کی ایک شاندار عمارت دہلی میں ہے۔ وہیں مولانا فروکش تھے۔ جمعیت علمائے اسلام کا دفتر شیخ الہندؒ کے نام پر ایک لائبریری اور اجتماعات کیلئے ایک وسیع ہال بھی یہیں واقع ہیں۔ کچھ اور نئی تعمیرات بھی ہو رہی ہیں' مولانا اسد' حضرت قاری محمد طیب مرحوم (مہتمم دارالعلوم دیوبند) سے میرے نیاز مندانہ تعلقات سے واقف تھے اور "جنگ" میں میرے وہ مضمون بھی ان کی نظر سے گذر چکے تھے جو میں نے دارالعلوم دیوبند کے مسئلہ پر ان کے اور حضرت قاری صاحب کے مابین رونما ہونے والے تنازعے پر سپردِ قلم کئے تھے۔ اس لئے تا دیر اپنے مؤقف کی وضاحت اور صفائی پیش کرتے رہے' دارالعلوم دیوبند کا معائنہ کرنے کی بھی دعوت دی اور میں نے اسے قبول بھی کر لیا مگر بدقسمتی سے بھارت کے دوسرے شہروں میں اپنے دورے کے طول کھینچ جانے کی وجہ سے یہ خواہش پوری نہ ہوئی' میرے بیٹھے بیٹھے مولانا سے ملنے کیلئے بہت سے اہم لوگ آئے' ان سے مشوروں کے طالب ہوئے اور انہوں نے کسی کو مایوس

نہیں کیا۔ اس میں شبہ نہیں کہ مولانا اسد مدنی بھارت کے مسلم زعماء میں ایک بڑی فعال اور باہمت شخصیت ہیں۔

دہلی آکر حضرت خواجہ نظام الدین محبوب الٰہیؒ کی درگاہ پر حاضری نہ دینا بڑی بدقسمتی کی بات ہے۔ میں جب بھی دہلی گیا ہوں، حضرت حسن ثانی نظامی کے طفیل یہ مرحلہ بڑی خیروخوبی کے ساتھ طے ہوا ہے۔ "مرحلہ" کا لفظ میں نے اس لئے استعمال کیا کہ عام زائر غریب درگاہ کے مجاوروں کے ہاتھوں جس طرح لٹتا اور پٹتا ہے اور دیکھتے ہی دیکھتے ایک لشکر کا لشکر اس پر پل پڑتا ہے اس سے سلامتی کے ساتھ نکل آنا ایک مرحلہ سے کم نہیں۔ مجھ سے غلطی یہ ہوئی کہ اب کے خواجہ حسن ثانی کو فون کئے بغیر درگاہ کی جانب چل کھڑا ہوا۔ وہ اتفاق سے تشریف فرما نہ تھے سوچا حضرت پیر ضامن نظامی کی زیارت کر لوں، (پیر صاحب سرکاری طور پر درگاہ کے سجادہ نشین مانے جاتے ہیں) وہ 82 سال کے ہو چکے ہیں۔ ان دنوں بیمار تھے ان کے خوش اخلاق صاحبزادے خواجہ احمد نظامی سے ملاقات ہو گئی انہوں نے پُرتکلف چائے پلائی، شعر کا اچھا ذوق رکھتے ہیں ان کی خواہش تھی کہ ایک شب میرے اعزاز میں اپنے ہاں ایک مختصر اور منتخب محفلِ مشاعرہ کا اہتمام کریں۔ یہیں اجمیر شریف کے سجادہ نشین خاندان کے ایک صاحبزادے بھی مل گئے۔ میں نے اجمیر شریف میں حاضری دینے کے بعد درگاہ کے مجاورین کے بارے میں، "مشاہدات و تاثرات" میں جو اظہارِ خیال کیا تھا وہ ان تک بھی پہنچ چکا تھا۔ ان کی خواہش تھی کہ ایک مرتبہ پھر آؤں تاکہ وہ میرے سامنے "اصل حقائق" لا سکیں۔ خواہش تو میری بھی اجمیر شریف جانے کی بہت ہے مگر دیکھئے یہ آرزو کب پوری ہو؟ چائے کے بعد خواجہ احمد نظامی مزار مبارک پر سلام کیلئے لے گئے۔ مجاوروں نے محسوس تو بہت کیا کہ ایک آسامی ہاتھ سے نکل گئی مگر احمد صاحب کی وجہ سے ان کا بس نہیں چلا۔ ایک مجاور نے البتہ شروع سے آخر تک پیچھا کیا، ہار بھی گلے میں ڈالے اور چادر بھی پہنائی۔ گاڑی تک میرا سارا شجرۂ نسب دہراتا چلا آیا۔ میانوالی سے نیازی خاندان کے اور کون کون افراد یہاں کس کس سال میں آتے رہے ہیں۔ یہ اس بندۂ خدا نے ازبر کر رکھا تھا مگر مجھے مجاوری کے اس سارے نظام سے اتنی وحشت ہے کہ میں نے بھی جیب میں ہاتھ ڈال کر نہیں دیا، وہ بھی کیا یاد کرے گا کس کنجوس آدمی سے پالا پڑا تھا۔

ایک شام شہری ترقیات کی وزیر محترمہ محسنہ قدوائی نے اپنے ہاں چائے پر مدعو کیا۔ وہ یوپی کانگرس کی صدر رہ چکی ہیں اور ساٹھ کے عشرے سے سیاست میں ہیں۔ (افسوس کہ اس مرتبہ الیکشن میں ہار گئی ہیں) ان کے ماں باپ کراچی آ گئے تھے مگر یہ خود وہیں رہ گئیں، نہرو خاندان سے بہت قربت رکھتی ہیں، ان کے ہنس مکھ اور یاروں کے یار بھائی صلاح الدین پاکستان کے کرکٹ کھیلنے والوں میں بڑا نام رکھتے ہیں اور ان دنوں پی آئی اے سے وابستہ ہیں۔ ہم ڈرائنگ روم میں جا کر بیٹھے ہی تھے کہ ایک ادھیڑ عمر کی خاتون بڑا معقول لباس پہنے آداب و تسلیمات کرتے اندر داخل ہوئیں میں تو میزبان کو پہچانتا تھا مگر میرے ساتھی

علامہ سعید الرشید عباسی کو مغالطہ ہوا وہ سمجھے یہی محسنہ قدوائی ہیں وہ حسبِ عادت اٹھ کر تعظیم بجالائے' احترام بچھنا اور بچھتے چلے جانا ان کی فطرت ہے۔

یہاں بھی وہ اپنے خیال میں ایک مرکزی وزیر کو اپنی خوش اخلاقی سے متاثر کر رہے تھے مگر میں جانتا تھا کہ یہ خاتون گھر کی خادمہ ہے' ہم پنجابیوں نے ایسے ادب آداب کہاں دیکھے ہیں کہ خادمہ اور مالکہ میں امتیاز کر سکیں۔ میں اپنے ایک پنجابی دوست کی اس بدحواسی کا مزا لے رہا تھا۔ اس ڈرامے کا ڈراپ سین تب ہوا جب خاتون نے علامہ صاحب کے حد سے بڑھے ہوئے مظاہرہ اخلاق پر بوکھلا کر ان کی خدمت میں عرض کیا "آپ تشریف رکھیے چند لمحوں میں محترمہ محسنہ قدوائی تشریف لانے والی ہیں۔"

برِ صغیر پاک و ہند کے دو بہت ہی درخشاں نام حکیم عبدالحمید دہلوی اور حکیم محمد سعید دہلوی ہیں' یہ دونوں بھائی بڑی بڑی انجمنوں اور تنظیموں پر بھاری ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے سینے میں دردمند دل' سر میں خدمتِ ملک و ملت کا سودا' رگوں میں بجلیاں بن کر دوڑنے والا خون اور روح میں "قالو ابلیٰ" کی نغمگی بھر دی ہے۔ وہ دنیا کماتے ہیں مگر دین کیلئے وہ بھی فکر مند رہتے ہیں مگر اپنی سرزمین کیلئے۔ حکیم سعید سے میری دوستی کو ربع صدی کا زمانہ ہو چکا ہے۔ یہ رشتہ ان کے برادر بزرگ حکیم عبدالحمید صاحب بھی جانتے ہیں اس لئے دہلی جاؤں اور وہ ملنے تشریف نہ لائیں' کھانا نہ کھلائیں' یہ ناممکنات میں سے ہے' میں آرزو ہی کرتا رہ جاتا ہوں کہ خود ان کے حضور حاضری دوں مگر بڑے لوگوں میں عاجزی اور فروتنی ہی اس درجے کی ہوتی ہے کہ وہ کنواں ہونے کے باوجود خود پیاسے کے پاس چل کر جاتے ہیں۔

اب کے بھی یہی ہوا' حکیم صاحب اپنے لائق اور مستعد رفیقِ کار جناب قدوائی صاحب کے ساتھ تشریف لائے' عشائیہ کی تاریخ اور جامعہ ہمدرد دکھانے کی تفصیلات طے کیں اور مجھے اپنی کوتاہیِ قدم پر عرقِ خجالت میں غرق چھوڑ کر چلے گئے۔

جناب حکیم محمد سعید صاحب نے بھی کراچی میں "مدینتہ الحکمت" کے نام سے ایک یونیورسٹی کی داغ بیل ڈالی ہے۔ سنا ہے وہ اب پایۂ تکمیل تک پہنچنے کو ہے اسے دیکھنے کا تو اتفاق نہیں ہوا مگر "ہمدرد نگر" میں جامعہ ہمدرد" دیکھا تو ع............ ابھی کچھ لوگ باقی ہیں جہاں میں............ کی اُمید افزا خوشخبری پر ایمان لانا پڑا۔ نوے ایکڑ میں پھیلی ہوئی یہ یونیورسٹی دہلی کے تغلق آباد میں واقع ہے اور فیکلٹی آف سائنس' فیکلٹی آف اسلامک اسٹڈیز' فیکلٹی آف فارمیسی' فیکلٹی آف میڈیسن اور فیکلٹی آف نرسنگ پر مشتمل ہے۔ ڈیڑھ سو بستروں کا ایک جدید اور شاندار ہسپتال اس کے علاوہ ہے۔ لائبریری الگ دیکھنے سے تعلق رکھتی ہے۔ میں جب پہنچا تو یونیورسٹی کے شعبۂ اسلامی تحقیق کے زیرِ اہتمام اسلامی کیلنڈر پر سیمینار ہو رہا تھا۔ رویتِ ہلال کا مسئلہ زیرِ بحث تھا کہ عالم اسلام میں ایک ہی وقت میں عید منانے کی کیا صورت ہو سکتی ہے؟ یہ سفارشات اب اگلے سال ایک بین الاقوامی سیمینار میں پیش کی جائیں گی تاکہ ان پر امت کے اہلِ علم کا اجماع ہو سکے۔

کاش! ہمارے ہاں حکیم عبدالحمید اور حکیم محمد سعید جیسے چند اور اہلِ دل پیدا ہو سکتے! یہ ہو جائے تو ہمارا کون سا مسئلہ ہے، جو حل نہیں ہو سکتا؟

ایک دن ہوٹل میں "شمع" کے ایڈیٹر جناب ادریس دہلوی نے زحمت فرمائی، ادریس صاحب "مسافر" کے قلمی نام سے شمع میں جو فلمی ڈائری لکھتے ہیں وہ پاکستان اور ہندوستان دونوں جگہ بے حد مقبول ہے۔ ان کے بڑے بھائی جناب یونس دہلوی بھی میرے مہربانوں میں شامل ہیں۔ اس بار ان دونوں بھائیوں سے مصروفیات کی وجہ سے ملاقات نہیں ہوئی تھی اس کا افسوس تھا ادریس صاحب کی اچانک آمد سے خوشی ہوئی۔ وہ اسی دن پاکستان جا رہے تھے۔ اس لئے زیادہ دیر نہ ٹھہر سکے پھر بھی ان کے ساتھ جتنا وقت گزرا خوب گزرا۔

دہلی سے رخصت ہوتے ہوئے آخری لنچ تحریکِ آزادی کے ایک نڈر سپاہی محمد یونس خان کے ساتھ کھایا، خان صاحب صوبہ سرحد سے تعلق رکھتے ہیں اور خان عبدالغفار خان مرحوم کے معتمد رفقائے کار میں سے ہیں۔ ہندوستان تقسیم ہوا تو وہ دہلی میں آ کر بس گئے اور ایسے بسے کہ یہیں کے ہو کر رہ گئے۔ پنڈت نہرو اور ان کی فیملی سے انہیں بے حد لگاؤ تھا اور آج تک وہ اس لگاؤ کو "وفاداری بشرطِ استواری" کے انداز میں نبھائے چلے آ رہے ہیں، انڈونیشیا، الجزائر وغیرہ میں بھارت کے سفیر بھی رہے۔ آج کل راجیہ سبھا کے رکن ہیں، بات کرنے میں ننگی تلوار ہیں، کوئی لاگ لپیٹ نہیں رکھتے۔ جسے ناپسند کرتے ہیں اسے صاف کہہ دیتے ہیں "میں تمہیں ناپسند کرتا ہوں۔ میرے ہاں آ کر اپنا اور میرا وقت برباد نہ کرو" خوش مجلس ایسے ہیں کہ گھنٹوں ان کی باتیں سنتے رہیے سیری نہ ہوگی، ملاقات ہوئی تو بڑی مزے کی باتیں سنائیں۔ وہ پاک و ہند تعلقات کی بہتری کے سرگرم داعی ہیں۔ میں نے پوچھا "ہمارے ہاں جمہوری حکومت بننے کے بعد تو اس کا راستہ ہموار ہوا ہوگا؟" کہنے لگے "شروع کے چند دنوں میں اس کے کچھ آثار پیدا ہوئے تھے لیکن بعد میں صورتحال پھر ویسی کی ویسی ہو گئی ہے، غیر جانبدار ملکوں کی کانفرنس میں بیگم بھٹو نے مسئلۂ کشمیر پر تقریر کی ہم نے احتجاج کیا تو آپ کا فارن آفس کہتا ہے "ہماری داخلی مجبوریاں دیکھو" یہ تو ایسے ہی ہے جیسے پشاور میں ایک سیاسی لیڈر حکومت کا بہت نمک خوار تھا رات کو گورنر کے خلاف تقریر کرتا صبح جا کر ان کے پاؤں پکڑ لیتا اور رات کی تقریر کے حق میں دلیل یہ دیتا کہ ہمارے مخالف انگریزی راج پر تنقیدیں کر کے مقبول ہوتے جا رہے ہیں۔ میں نے سوچا میں تنقید کروں گا تو اس سے عوام میں میری مقبولیت بھی بڑھے گی اور میں مقبول ہوا تو میں آپ کا ہوں اس کا آخری فائدہ تو آپ ہی کو پہنچے گا۔

خان صاحب کو لکھنے پڑھنے کا بھی بہت شوق ہے۔ دو تین کتابیں بھی لکھی ہیں۔ اپنی ایک کتاب "قیدی کے خط" مجھے بھی پیش کی یہ تقسیم سے قبل ان کے زمانۂ نظربندی میں مختلف جیلوں سے ان کے لکھے ہوئے خطوط پر مشتمل ہے۔

ہمارے صدر محترم غلام اسحٰق خان صاحب ان کے بچپن کے دوست ہیں اس حوالے سے کتاب کھول کر ایک اقتباس بطور خاص مجھے پڑھایا' اس میں یونس صاحب نے لکھا تھا۔

"پرسوں میرا ایک بہت ہی عزیز دوست غلام اسحٰق اچانک آ نکلا۔ تھوڑی دیر کیلئے تو ہم دونوں ایک دوسرے کی طرف ٹکٹکی باندھے کھڑے رہے مگر وہ جوں کا توں بُت بنا کھڑا رہا۔ بیٹھنے کو کہا' بات کرنا چاہی مگر سب بے کار وہ کھڑا کھڑا ہر چیز کو دیکھتا رہا اور پھر یکایک سلام علیکم کہہ کر چلا گیا۔ بعد میں ڈپٹی جیلر جو اس کے ساتھ آیا تھا واپس لوٹا اور بتایا کہ غلام اسحاق کسی ملزم کا بیان لینے جیل آیا اور تم سے ملنے کی خواہش کی مگر تمہیں اس ڈربہ میں بند اور اس حالت میں دیکھ کر ایسا سٹپٹایا کہ اپنے جذبات کو قابو میں نہ رکھتے ہوئے جانے ہی کو بہتر سمجھا۔"

میں نے اقتباس پڑھا تو یونس صاحب سے کہا "خان صاحب! یہ ہمارے صدرِ محترم خان غلام اسحٰق خان صاحب کے جذبات میں آنے کی بات آپ نے خوب لکھی کیا آپ کے نزدیک وہ بھی جذبات رکھتے ہیں"؟ کہنے لگے "اس وقت تو رکھتے تھے' اب کا معلوم نہیں۔" اس پر خوب قہقہہ پڑا دلّی میں سو گھنٹے گزار کر بھی یوں لگا جیسے فقط سو لمحے اور سو ثانیئے گزرے ہوں۔ بہت کچھ دیکھا مگر کچھ بھی نہ دیکھا ہاں یہ تاثر ضرور دل پر لے کر لوٹا کہ گویہ بہت اُجڑی ہے مگر دلّی میں اب بھی بہت سے دل والے بستے ہیں۔ رہے اس کی خاکِ پاک میں آرام فرما اہلِ کمال تو ان کے بارے میں تو مولانا حالیؔ فرما ہی چکے ہیں۔

چپّے چپّے پہ ہیں یہاں گوہرِ یکتا تہہِ خاک
دفن ہوگا کہیں اتنا نہ خزانہ ہرگز

پاکستان میں سب سے زیادہ ووٹ حاصل کیے۔ 1977ء میں دوبارہ قومی اسمبلی کے رکن منتخب کیے گئے۔

8- 1971ء میں صدر کے حج، اوقاف اور اطلاعات امور کے مشیر بنائے گئے۔

9- 1972ء سے 1977ء تک حکومتِ پاکستان کے سینئر وفاقی وزیر رہے اور آپ کے پاس مذہبی امور، اطلاعات و نشریات، اقلیتی امور اور غیر ملکی پاکستانیوں سے متعلق امور کی وزارتیں رہیں۔

10- 1975ء میں بین الاقوامی سیرت کانفرنس کے چیئرمین چنے گئے جس کا ہر سال کسی نہ کسی مسلم ملک میں اجلاس منعقد کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔

11- سعودی عرب جانے والے پاکستان کے سرکاری حج وفود کی 1965ء سے 1977ء تک تقریباً ہر سال قیادت کرتے رہے۔ انگلستان، مصر، لیبیا، کویت، متحدہ عرب امارات، شام، عراق، ایران اور ترکی جانے والے سرکاری وفود کے بھی قائد رہے۔ آپ نے دنیا کے بیشتر ممالک کا سفر کیا ہوا ہے اور سفرنامے بھی لکھے ہیں جو کہ پاکستان میں مقبول عام ہیں۔

12- 1977ء میں آپ پاکستان پیپلز پارٹی کے سیکرٹری جنرل منتخب ہوئے۔

13- آپ ملک کے ہر دلعزیز مقرر اور خطیب ہیں ناظرین کو گھنٹوں اپنے سحر میں جکڑ لینے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔

14- 1985ء میں قومی اسمبلی کے اراکین کے 171 ووٹوں میں سے 151 ووٹ لے کر سینیٹ کے رکن منتخب ہوئے۔

15- آج کل سیاسی طور پر آپ کی وابستگی کسی جماعت سے نہیں ہے۔